مَن یُرِدِ اللہُ بِہٖ خَیراً یُفَقِّھہُ فِی الدِّین

فقہی ضوابط

تشریحات، تفریعات، تمثیلات

تالیف

مفتی اسامہ پالن پوری ڈینڈرولوی

خادم الافتاء والحدیث دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور

حصہ سوم

نظر ثانی

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

مکتبہ حجاز دیوبند

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہه فی الدین

فقہی ضوابط

تشریحات، تفریعات، تمثیلات

حصہ سوم

تالیف

مفتی اسامہ پالن پوری (ڈینڈر رلوی)

خادم الافتاء والحدیث دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور

نظر ثانی

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

نام کتاب : فقہی ضوابط (تشریحات، تفریعات، تمثیلات)

تالیف : مفتی اسامہ پالن پوری (ڈینڈرولوی)

خادم الافتاء والحدیث دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور

نظر ثانی : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

طباعت : جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ مطابق اپریل ۲۰۱۳ء

باہتمام : قاسم احمد پالن پوری

سیٹنگ : مولوی حسن احمد پالن پوری فاضل دارالعلوم دیوبند

09979993070

ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند

مطبوعہ : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج نئی دہلی

ملنے کے پتے

MAKTABA HIJAZ

Urdo Bazar Jama Masjid Deoband

247554 (U.P.) India M.09997866990

گجرات میں ملنے کا پتہ: مفتی اسامہ پالن پوری (ڈینڈرولوی)

دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور۔09979993070

فہرست مضامین

فہرست ضوابط وفوائد

[کتاب الدعویٰ]

ضابطہ

[کتاب الشهادة والاخبار]

[باب الإخبار]

[کتاب الإقرار]

[کتاب القضاء]

[تحکیم یعنی ثالثی کا بیان]

[کتاب الصلح]

[کتاب الإبراء]

[کتاب المضاربة]

[کتاب الشرکة]

[کتاب المزارعة]

[کتاب الأیمان]

[کتاب النذر]

[کتاب اللقطة]

[کتاب اللقيط]

[کتاب الوقف]

پیش لفظ

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم

(شیخ الحدیث وناظم :المعہد العالی اسلامی حیدرآباد؛ جنرل سیکریٹری
اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا؛ رکن رکین آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی علوم میں فقہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے؛ کیونکہ فقہ کتاب اللہ سنت رسول، آثار صحابہ اور اجماع امت کا عطر اور خلاصہ ہے اور اسلامی تاریخ کی بہترین ذہانتیں اس علم کی آبیاری میں صرف ہوئی ہیں، فقہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے اس سے مربوط مختلف ذیلی علوم وفنون بھی مدون ہوئے ہیں، جو استنباط احکام نصوص کی تطبیق وترجیح اور شریعت کی مصالح وحکم کی رعایت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، ان علوم میں اصول فقہ اور قواعد فقہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

اصول فقہ استنباط احکام کا ذریعہ ہیں اور قواعد فقہ مستنبط شدہ احکام کو سامنے رکھ کر مرتب کئے جانے والے اصول وقضایا ہیں، اصول فقہ کا تعلق زیادہ تر عربی زبان کے قواعد اور طریقۂ استنباط سے ہوتا ہے اور قواعد کا تعلق زیادہ تر شریعت کی مصالح اور حکمتوں سے، اصول فقہ کی جہاں اس پہلوں سے اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ استنباط احکام کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے، وہیں قواعد فقہ کی اس لحاظ سے اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ شریعت کے مقاصد مصالح کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور شریعت اسلامی کے فلسفہ پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زیادہ تر قواعد فقہ کی بنیادیں براہ راست کتاب وسنت میں موجود ہیں، مثلاً فقہ کا ایک قاعدہ ہے: ''الامور بمقاصدھا'' اس کی بنیاد حدیث نبوی: انما الأعمال بالنیات'' ہے فقہ کا ایک اور قاعدہ ہے: ''الحرج مدفوع'' اس کی اساس اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'' (الحج:۷۸) ہے——یوں تو قواعد کا لفظ ان قواعد پر بھی بولا جاتا ہے جن کا تعلق مختلف فقہی ابواب سے ہو اور ان قواعد پر بھی جن کا تعلق کسی ایک ہی فقہی باب سے ہو؛ لیکن یہ اطلاق لغوی معنی کے اعتبار سے ہے؛ اہل علم نے اصطلاح کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا ہے، پہلی قسم کے قواعد کو اصطلاح میں ''قاعدہ'' کہتے ہیں اور دوسری قسم کے قواعد کو 'ضابطہ' جیسے ''أیما إھاب دبغ فقد طھر'' اس کا تعلق احکام طہارت سے ہے؛ اس لئے اصطلاح اعتبار سے اسے ضابطہ کہیں گے؛ یا جیسے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه'' اس کا تعلق قضاء کے باب سے ہے، اس لئے ضابطہ کہلائے گا۔

غور کیا جائے تو قواعد اور ضوابط دونوں کی مثالیں قرآن مجید اور خاص کر حدیثوں میں بھی ملتی ہیں، صحابہ کے یہاں خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایات میں ایسے متعدد فقرے ملتے ہیں، جن پر قاعدہ اور ضابطہ کا اطلاق ہوسکتا ہے، بعد کے فقہاء میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کی تالیفات میں ضمنی طور پر بہت سے قواعد آگئے ہیں، لیکن اس علم کی باضابطہ تدوین چوتھی صدی ہجری میں پائی گئی ہے، ابوطاہر دباسی اسی صدی کے تھے، انہوں نے سترہ قواعد مرتب کئے تھے، اور ان پر فقہ حنفی کی تمام جزئیات کو منطبق کرتے تھے، پھر امام ابوالحسن کرخیؒ (متوفی: ۳۴۰ھ) کی 'اصول کرخی' قاضی ابوزید دبوسیؒ (متوفی: ۴۳۰ھ) کی 'تاسیس النظر' اور علاء الدین سمرقندی (متوفی: ۵۴۰ھ) کی 'ایضاح القواعد' کا ذکر آتا ہے، یہ سب کے سب احناف ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ فن فقہاء احناف کی اولیات میں سے ہے۔

زیادہ تر قواعد فقہ پر تالیفات اس طرح مرتب کی گئی ہیں کہ ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ذیل میں کچھ ضابطے آگئے ہیں جو مختلف ابواب فقہیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی کہ ہر باب فقہی سے متعلق ضوابط الگ الگ ذکر کئے جائیں، جیسے 'کتاب الطہارت' سے متعلق ضوابط کتاب الطہارت کے تحت، کتاب الصلوٰۃ سے متعلق ضوابط 'کتاب الصلاۃ' میں کے تحت؛ البتہ یاد آتا ہے کہ مفتی دمشق شیخ محمود حمزہ حنفی کی 'الفوائد البھیہ فی الفوائد و القواعد الفقھیہ' (ط: ۱۹۲۸ء) میں اس پر توجہ دی گئی ہے۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب مفتی اسامہ پالن پوری (استاذ حدیث و مفتی دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور) نے دو حصوں پر فقہی ضوابط کے نام سے اس موضوع پر بہت ہی قابل تحسین کام کیا ہے، ہمارا اردو تالیفات کثرت اور چھپنے کی عجلت کا دور ہے، اس لئے بہت سی رطب و یابس چیزیں شب و روز سامنے آتی رہتی ہیں؛ لیکن مؤلف کی یہ کاوش 'تالیف برائے تالیف' نہیں ہے؛ بلکہ واقعی اس سے ایک ایسے گوشہ کی تکمیل ہوتی ہے جس پر کام کی ضرورت تھی، مؤلف نے اس کتاب میں طہارت سے لے عبادات، مناکحات اور معاملات تک تمام ان ابواب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، جن میں فقہاء نے کوئی ضابطہ بیان کیا ہے، ان ضوابط کو بھی ذکر کیا ہے جن کا فقہ کی کتابوں میں بطور ضابطہ ذکر آیا ہے اور ان ضوابط کا بھی جن کو ضابطہ کی زبان میں بیان نہیں کیا گیا ہے؛ لیکن جزئیات کو سامنے رکھا جائے تو وہ ضابطہ ان میں کارفرما نظر آتا ہے، یعنی مؤلف عزیز نے صرف نقل ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے؛ بلکہ استنباط سے بھی کام لیا ہے۔

ہر ضابطہ کی تشریح کی گئی ہے، جو نہ بہت طویل ہے اور نہ تشنہ، پھر تفریعات اور مثالوں کے ذریعہ انھیں واضح کر دیا گیا ہے، قواعد کی تطبیق میں بہت سے نئے مسائل بھی آگئے ہیں، اس کے علاوہ مؤلف نے مدرسین اور طلبہ کی سہولت کے لئے احکام

فقہیہ کے چارٹ (خرائط) بھی مع حوالہ بنادئے ہیں، غالباً اردو زبان میں اس طرح کی یہ پہلی کوشش ہے، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ کے اساتذہ وطلبہ کے لئے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہے، اس حقیر کا اپنا تجربہ ہے کہ اس نے ہدایہ ثانی کی تدریس کے دوران کوشش کی تھی کہ مختلف مباحث سے متعلق کچھ فقہی قواعد وضوابط سامنے رکھے اور اس پر مسائل کی تفریع کرے، چنانچہ پہلے اس قاعدہ یا ضابطہ کو بیان کردیتا پھر اصل مسئلہ پر گفتگو کرتا، طلبہ اس سے بہت اطمینان اور خوشی محسوس کرتے؛ بلکہ نوجوان اساتذہ بھی اس سبق میں آکر بیٹھنے کی کوشش کرتے، اس لئے اگر اساتذہ اس کتاب کو اپنے سامنے رکھیں گے تو انشاء اللہ نفع محسوس کریں گے۔

یہ بات بھی بہت اطمینان کی ہے کہ اس کتاب پر حدیث وفقہ کے میدان کی مشہور شخصیت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث وصدر مدرس دارالعلوم دیوبند) نے نظر ثانی کی ہے اور مؤلف نے ان کی نگرانی میں اس کام کو انجام دیا ہے —— دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اس کے نفع کو عام وتام فرمائے اور ان سے دین اور علم دین کی مزدی خدمت لے۔ واللہ ہو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۹ر شعبان ۱۴۳۳ھ

۲۹ر جون ۲۰۱۲ء

تقریظات

①

حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم
(صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

انسانی زندگی میں عبادات و معاملات اور اعمال و اخلاق کی ہزاروں بلکہ لاکھوں جزئیات ایسی ہیں جن کے اصول و ضوابط اگرچہ مکمل طور پر قرآن و حدیث اور فقہی اصول وقواعد میں بیان کردئے گئے ہیں لیکن ان ضوابط کا افراد پر منطبق کرنا اور اصول سے جزئیات کا استخراج کرنا یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے اور نہ ہر شخص اس کی صلاحیت واستطاعت رکھتا ہے۔

انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جس طرح مختلف جدید مسائل پیدا ہوتے ہیں فقہاء اسلام قرآن و حدیث اور دیگر فقہی اصول وضوابط کی روشنی میں مستنبط کرتے رہتے ہیں، اس میں نہ کوئی جمود ہوا ہے نہ کوئی تساہل، آج بھی دنیا کی رنگارنگ بوقلمونیوں اور معاشرت کے عجیب وغریب اور حیران کن مسائل کو حل کرنے کے لئے انہی فقہی ضوابط کو سامنے رکھتے ہیں اور پھر لوگوں کی علمی پیاس بجھاتے ہیں اور آئندہ بھی بجھاتے رہیں گے۔

اس میں دورائے نہیں کہ جب کسی متبحر عالم کو فقہی ضوابط پر عبور ہوجاتا ہے تو اسے اس کے متعلق تمام مالہ وماعلیہ مسائل پر دسترس حاصل ہوجاتی ہے اور ان مسائل کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے جیسے کوئی بیرسٹر قوانین کی روشنی میں بیبا کی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور اشکالات کرنے والوں کے اشکالات کو بھی حل کرتا ہے، اسے پیش آمدہ جزئیات

کو بیان کرنے کے لئے دلائل تلاش کرنے کی حاجت نہیں ہوتی، وہ اصول پر ایسا حاوی ہوتا ہے کہ وہ دلائل سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ہر مسئلہ ہر جزئیہ انہی اصول کی روشنی میں سمجھتا جاتا ہے پھر تمام فروعی مسائل کو آسانی کے ساتھ دوسروں کو بھی سمجھا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے عزیز محترم مفتی اسامہ سلمہ کو جو اس وقت دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور گجرات میں حدیث وافتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، انہوں نے فقہ اسلامی کے گہرے سمندر میں غوطہ زنی فرمائی اور بہت سارے قیمتی موتی نکال لائے اور فقہی ضوابط کے نام سے انہیں جمع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت شاقہ کو قبول فرمائے اور علم فقہ پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کے لئے اسے نفع بخش بنائے اور مفتی صاحب موصوف کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

حبیب الرحمن خیرآبادی عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۶ر شعبان ۱۴۳۳ھ

۲

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم
(شیخ الحدیث ومفتی مدرسہ شاہی مرادآباد)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

حضرت مولانا مفتی اسامہ صاحب پالن پوری ”مدظلہ“ مفتی دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور کی کتاب ”فقہی ضوابط“ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی احقر نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے ماشاء اللہ ہر ضابطہ کو مثالوں سے واضح کردیا گیا ہے اور یہ کتاب (فی الحال ہمارے سامنے) دو جلدوں میں ہے ہر جلد کے آخر میں جدول اور نقشہ کے ذریعہ سے ہر موضوع کے مسائل کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے احقر کو یہ امید ہے کہ یہ کتاب ”تعریفات جرجانی“ سے بھی برصغیر کے علماء اور طلبہ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگی اسی طرح ”لغۃ الفقہاء“ اس میں معمولی نظیر ہوتی ہے لیکن زیر نظر کتاب کے اندر جزئیات کے ذریعہ سے اصولوں کو بہت شاندار انداز سے واضح کیا گیا ہے اس لئے زیادہ مفید ثابت ہونے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو عنداللہ اور اہل علم کے حلقہ میں قبول فرمائے اور مؤلف محترم کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین

شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

خادم مدرسہ شاہی مرادآباد یوپی

۷؍شعبان ۱۴۳۳ھ

④

حضرت مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری مدظلہ العالی

(شیخ الحدیث ومفتی مدرسہ شاہی مراد آباد)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

اس وقت احقر کے سامنے ایک نہایت مفید اور طلبہ وعلماء اور مفتیان کے لئے نفع بخش کتاب ''فقہی ضوابط'' ہے جسے ایک نوجوان محنتی اور محقق عالم جناب مولانا مفتی اسامہ صاحب پالن پوری ''زید علمہ وفضلہ'' استاذ فقہ وحدیث دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور گجرات نے مرتب کیا ہے۔

یہ کتاب بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ لکھی گئی ہے جس میں کتاب الطہارت سے لے کر کتاب الہبہ تک ہر باب سے متعلق چارسوتیس ضوابط جمع کر کے ہر ضابطہ کے تحت ضروری اور عام فہم جزئیات درج کردی گئی ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے بالخصوص فقہ وفتاوی میں مشغول طلبہ واساتذہ کو بھرپور رہنمائی ملے گی، فقہی کتابوں کا سمجھنا آسان ہوگا اور علم میں بصیرت اور جلاء پیدا ہوگی۔

راقم الحروف نے بالخصوص ہدایہ آخرین کی تدریس کے دوران اس بات کو محسوس کیا تھا کہ صاحب ہدایہ کی پوری گفتگو کسی نہ کسی اصول کے اردگرد گھومتی ہے اور پھر وہ اپنے انداز میں اسی اصول کی تفریع کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ اصول ان کی طرف سے پیش کردہ دلائل سے بآسانی سمجھے جاسکتے ہیں، پس اگر طالب علم ہر باب وفصل کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ہدایہ کا مطالعہ کرے گا تو اس کے لئے یہ مشکل کتاب حد درجہ آسان ہوجائے گی، اسی لئے احقر نے سالوں تک ہدایہ کی تدریس کے دوران طلبہ کو ہر

باب کے بنیادی اصول اردو میں نوٹ کرانے کا اہتمام رکھا، تاہم ہجوم کار اور گوناگوں مشاغل کی وجہ سے الگ سے ان کو ترتیب دینے کا موقع نہ مل سکا، بہرحال اب تقریبا اسی سے ملتی جلتی یہ کتاب ’’فقہی ضوابط‘‘ سامنے آنے پر ایک گونہ خوشی ہوئی اور فاضل مرتب کے لئے دل سے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ موصوف کو بے حد جزائے خیر عطا فرمائے۔

اصول پر فقہی جزئیات کی تفریع کے سلسلہ میں علامہ ابن نجیمؒ کی کتاب ’’الاشباہ والنظائر‘‘ بے نظیر تالیف ہے، لیکن عموما اس کو دارالافتاء میں جلدی جلدی رواروی میں پڑھادیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اکیلی ایسی کتاب ہے کہ پورے سال اس کے مسائل کی تخریج اور اصول پر انطباق کی تمرین میں محنت کرائی جاسکتی ہے، اس کا کچھ تجربہ دارالافتاء مدرسہ شاہی میں تکمیل افتاء کے طلبہ پر کرایا گیا تو اس کے اچھے نتائج سامنے آئے، اور طلبہ کو اصول سے مناسبت پیدا ہوئی، اگر دیگر جگہوں پر بھی اس جانب توجہ دی جائے تو بے نظیر فائدہ کی امید ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

فقط واللہ الموفق

احقر محمد سلمان منصور پوری
خادم مدرسہ شاہی مرادآباد
۵-۸-۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الدعوی

۲۳۱۔ **ضابطہ:** گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور مدعلیہ کے ذمہ قسم کھا کر دعوے سے براءت ظاہر کرنا ہے[1]۔

تشریح: اولا مدعی کے ذمہ گواہوں کو پیش کرنا ہے اگر وہ گواہ پیش کرنے سے عاجز رہ جائے تو مدعی علیہ کے ذمہ قسم کھا کر دعوے سے براءت ظاہر کرنا ہے (بشرطیکہ مدعی اس سے قسم کا مطالبہ بھی کرے کیونکہ قسم لینا مدعی کا حق ہے)

فائدہ: پھر اگر مدعی علیہ نے مدعی کے مطالبہ پر قسم کھالی یا مدعی کی طرف سے قسم کا مطالبہ ہی نہیں کیا گیا تو قاضی مدعی علیہ کا حق ثابت کردے گا اور مدعی کو اس سے معارضہ کرنے سے روک دے گا۔ اور اگر مدعی علیہ نے جبکہ اس سے مطالبہ کیا گیا قسم سے انکار کردیا جس کو عربی میں "نکول عن الحلف" کہتے ہیں تو قاضی مدعی کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ پھر قاضی کے فیصلے کے بعد اگر مدعی علیہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں تو اب اس کی بات کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی اور قاضی کا فیصلہ بحال رہے گا۔[2]

---

(۱) البینة للمدعي و الیمین علی من أنكر (قواعد الفقه ص: ٦٦ قاعده: ٦٥)

(۲) المادة (۱۸۱۸): إن أثبت المدّعِي دعواه بالبینة حكم القاضِي له بذلك وإن لم یثبت یبق له حق الیمین فإن طلبه كلّف القاضِي المدعى علیه الیمین بناءً على طلبه۔

المادة (۱۸۱۹): فإن حلف المدعى علیه الیمین أو لم یحلِفه المدّعِي منع القاضي المدّعِي من معارضة المدعى علیه۔ ←

۴۳۲- **ضابطہ**: مدعی وہ ہے جو مقدمہ سے دستبردار ہو جائے تو اسے مجبور نہ کیا جا سکے، اور مدعی علیہ وہ ہے جو مقدمہ کی پیروی نہ کرے تو اسے مجبور کیا جائے۔

تشریح: علم قضا میں مدعی اور مدعی علیہ کی پہچان بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ اسی پر مقدمہ کے فیصلے کا مدار ہے، پھر یہ جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک و مشکل بھی ہے — اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں بطور ضوابط مختلف تعبیرات ملتی ہیں، مثلاً جو خلاف ظاہر کا دعویٰ کرے وہ مدعی ہے اور جو ظاہر کے موافق دعویٰ کرے وہ مدعی علیہ ہے، یا جو ملکیت یا حق کو ثابت کرتا ہو وہ مدعی ہے اور جو اس کی نفی کرتا ہو وہ مدعی علیہ ہے وغیرہ — مگر ان میں سب سے اچھی اور جامع تعبیر وہ ہے جو ضابطہ میں ذکر کی گئی، یہ امام قدوریؒ کی بیان کردہ ہے اور اس کے متعلق صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں: "ھو حد عام صحیح" یعنی یہ ایک جامع اور صحیح تعریف ہے۔[1]

۴۳۳- **ضابطہ**: سبب کا دعویٰ اس سے ثابت ہونے والے حکم کے دعویٰ کے مانند ہے۔[2]

← المادة (۱۸۲۰): إذا نكل المدعى عليه عن اليمين حكم القاضي بنكوله وإذا قال بعد حكم القاضي بنكوله أحلف لا يلتفت إلى قوله۔ (مجلة الأحكام العدلية: ۱/۳۷۰، المكتبة الشاملة)

(۱) قال: (المدعي من لا يجبر على الخصومة إذا تركها والمدعى عليه من يجبر على الخصومة) ومعرفة الفرق بينهما من أهم ما يبتنى عليه مسائل الدعوى، وقد اختلفت عبارات المشايخ رحمهم الله فيه، فمنها ما قال في الكتاب وهو حد عام صحيح (هدايه على هامش العناية: ۱۱/۲۵۲، كتاب الدعوى، المكتبة الشاملة)

(۲) دعوى السبب كدعوى الحكم الثابت بالسبب۔ (قواعد الفقه ص: ۸۱، قاعدہ: ۱۳۴)

تفریع: پس حکم کے دعویٰ میں جن شرائط کا ہونا ضروری ہے سبب کے دعویٰ میں بھی ضروری ہوگا، جیسے خریدنا سبب ہے ملکیت کا اور ملکیت اس کا حکم ہے پس جس طرح ملکیت کے دعویٰ میں بینہ پیش کرنا ضروری ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص دوسرے کے قبضے میں موجود کسی چیز کے خریدنے کا دعویٰ کرے تو اس میں بھی بینہ پیش کرنا مدعی پر ضروری ہوگا۔

اسی طرح میاں بیوی کے درمیان رضاعت کا دعویٰ سبب ہے ملک نکاح کے بطلان کا یعنی نکاح صحیح نہ ہونے کا اور نکاح صحیح نہ ہونے کے دعویٰ میں باقاعدہ نصاب شہادت (یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت) ضروری ہے تو میاں بیوی میں حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے بھی نصاب شہادت ضروری ہوگا، تنہا عورتوں کی شہادت سے رضاعت ثابت نہ ہوگی۔[1]

۴۳۴- **ضابطہ**: عرصۂ دراز تک دعویٰ نہ کرنے سے حق ساقط نہیں ہوتا۔[2]

تشریح: پس فقہاء کی عبارتوں میں مختلف دعاویٰ میں پندرہ سال تیس سال یا چھتیس سال وغیرہ کی جو تحدید ہے یعنی اس مدت تک مدعی دعویٰ نہ کرے تو اس کے بعد دعویٰ کی سماعت نہیں ہوگی وہ بطور انسداد حیلہ وتزویر ہے، لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہوجائے کہ مدعی واقعۃً حق پر ہے تو خواہ کتنا ہی عرصہ گزر جائے اس کا دعویٰ قابل سماعت ہوگا یہی صحیح ہے جیسا کہ شامی، درر وغیرہ میں اس کی صراحت ہے۔[3]

۴۳۵- **ضابطہ**: جو جرم حقوق اللہ سے متعلق ہو ان میں کسی کی طرف سے دعویٰ ضروری نہیں (بغیر دعویٰ کے قاضی تعزیر کرسکتا ہے) اور جو حقوق العباد سے متعلق

---

(۱) (شرح السیر: ۲۸/۵، ھدایہ: ۳۴۵/۲)

(۲) الحق لا یسقط بتقادم الزمان۔ (الاشباہ والنظائر:)

(۳) (مستفاد: احسن الفتاویٰ: ۲۱۰/۷، فتاویٰ دارالعلوم: ۱۸۶/۱۵، ردالمحتار: ۲۱/ ۱۱۷-۱۱۷، درر الحکام فی شرح المجلۃ: ۲۶۴/۱۱)

ہو اس میں دعویٰ ومطالبہ ضروری ہے (اس کے بغیر قاضی تعزیر نہیں کرسکتا ہے)[۱]

کتاب الشہادۃ والإخبار

۴۳۶- **ضابطہ:** شہادت میں لفظ شہادت (میں شہادت دیتا ہوں یا گواہی دیتا ہوں) کا ہونا ضروری ہے۔[۲]

تفریع: پس اگر کہے کہ میں خبر دیتا ہوں یا اطلاع دیتا ہوں وغیرہ تو یہ شہادت نہ کہلائے گی اور اسلامی عدالت میں اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

اسی بنا پر اخرس (گونگے) کی گواہی معتبر نہیں، کیونکہ لفظ شہادت اس سے ادا نہ ہوگا جبکہ صحت شہادت کے لئے اس لفظ کا ہونا ضروری ہے۔[۳]

استدراک: اور جن امور میں لفظ شہادت ضروری نہیں جیسے پانی کی طہارت، ذبیحہ کی حلت وحرمت وغیرہ میں تو وہ اخبار (خبر دینے) کے قبیل سے ہیں، شہادت کے قبیل سے نہیں ہیں۔[۴]

۴۳۷- **ضابطہ:** گواہ کا بالغ، آزاد، مسلمان اور عادل ہونا ادائے شہادت کی

(۱) ویملک اقامۃ التعازیر ما کان حقا للہ تعالی بلا طلب أحد وما کان حق عبد بطلبہ (البحر الرائق: ۲۹۶/۶، کتاب القضاء، فصل تقلید من شاء من المجتہدین، شاملۃ)

(۲) ومنہا لفظ الشہادۃ فلاتقبل بغیرہا من الألفاظ، کلفظ الإخبار والإعلام۔ (بدائع: ۴۱۱/۵)

(۳) ومنہا النطق فلاتقبل شہادۃ الأخرس، لأن مراعاۃ لفظ الشہادۃ شرط صحۃ أدائہا ولا عبارۃ للأخرس أصلاً فلا شہادۃ لہ (بدائع: ۴۰۲/۵)

(۴) وکل مالایشترط فیہ ھذا اللفظ کطہارۃ ماء ورؤیۃ ھلال فھو اخبار لاشہادۃ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار: ۱۷۸/۸)

شرط ہے، تحمل شہادت کی نہیں۔ [1]

تشریح: تحمل شہادت سے مراد واقعہ پیش آنے کے وقت اس کا مشاہدہ کرنا ہے تاکہ بوقت ضرورت اس کا بیان دے سکے۔ اور ادائے شہادت سے مراد دیکھے ہوئے واقعہ کا قاضی کے سامنے اظہار کرنا ہے تاکہ قاضی اس کی روشنی میں فیصلہ کر سکے۔

پس واقعہ کے مشاہدہ کے وقت کوئی نابالغ تھا اور ادائے شہادت کے وقت بالغ ہو چکا ہے، یا فاسق تھا اور عادل ہو گیا یا کافر تھا اور مسلمان و عادل ہو گیا تو اب وہ شخص عدالت میں مقبول ہے اور اس کی گواہی معتبر ہو گی، لیکن برعکس صورت میں یعنی تحمل کے وقت عادل تھا اور ادا کے وقت فاسق ہو گیا یا مسلمان تھا اور کافر ہو گیا (نعوذ باللہ) تو اس کی گواہی معتبر نہ ہو گی۔

۴۳۸- **ضابطہ**: شہادت کے لئے واقعہ کا معائنہ ضروری ہے۔

تشریح: البتہ بعض مخصوص چیزیں جیسے نکاح، موت، نسب، وقف، قاضی کی ولایت وغیرہ جن کا تعلق سماع سے ہے اور شہرت پر اعتماد کیا جاتا ہے ان میں سماع کی بنیاد پر یعنی لوگوں سے سن کر بھی شہادت دی جا سکتی ہے۔ [2]

تفریع: پس اگر کسی نے طلاق، ہبہ، اقرار وغیرہ کو دیوار یا مکان کے باہر سے سنا اور اس کے متعلق شہادت دی تو مقبول نہ ہو گی، کیونکہ ایک آواز دوسری آواز کے مشابہ ہوتی ہے پس جب تک براہ راست واقعہ کا مشاہدہ نہ کرے قطعی علم حاصل

---

(۱) وأما البلوغ والحرية والإسلام والعدالة: فليس من شرط التحمل، بل من شرائط الأداء۔ الخ (بدائع: ۵/ ۳۹۸)

(۲) الثالث: أن يكون التحمل بمعاينة المشهود به بنفسه لا بغيره، إلا في أشياء مخصوصة يصح التحمل فيها بالتسامع من الناس... فلا تطلق الشهادة بالتسامع إلا في أشياء مخصوصة وهي: النكاح والنسب والموت. الخ (بدائع الصنائع: ۵/ ۳۹۸- تاتارخانية: ۱۱/ ۲۱۱)

نہ ہوگا۔[1]

البتہ اس مسئلہ میں ایک خاص صورت جس کا تحقق بہت نادر ہے مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ پہلے سے کوئی گھر خالی ہو اور ایک شخص اس گواہ کے روبرو اس کے اندر گیا اور بجز اس دروازہ کے اور کوئی آنے کی جگہ بھی اس میں نہ ہو اور ایسی حالت میں اندر سے کوئی مضمون طلاق غیرہ کا سنائی دے تو یقین کیا جائے گا کہ اس جانے والے ہی کی آواز ہے، پس اس صورت میں شہادت جائز ہے۔[2] (امداد الفتاویٰ میں ہے کہ اس زمانہ کے اعتبار سے یہ بھی شرط ہوگی کہ اس مکان میں گراموفون بھی نہ ہو[3]۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ فی زمانہ موبائل، آئی پیڈ، کمپوٹر وغیرہ بھی نہ ہونے کی شرط ہوگی)

فائدہ: نابینا کی شہادت مقبول نہیں یعنی قاضی اس پر فیصلہ نہیں کرے گا [تاہم اگر کرلیا تو نافذ ہوجائے گا] اگرچہ تحمل شہادت کے وقت -یعنی واقعہ کے مشاہدہ کے وقت- وہ بینا ہو، اور اگرچہ اس کی شہادت ان امور سے متعلق ہو جن کا تعلق سماع سے ہے کیونکہ نابینا مشہود لہ اور مشہود علیہ میں کما حقہ تمیز نہیں کرسکتا ہے جو کہ ادائے شہادت میں ایک ضروری امر ہے، یہ حکم طرفین کے نزدیک ہے جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک اگر واقعہ کے مشاہدہ کے وقت بینا ہو پھر نابینا ہوگیا ہو تو اس کی شہادت معتبر ہے کیونکہ اس کو یہ علم معاینہ سے حاصل ہوا ہے۔[4]

---

(۱) ولو سمع من وراء الحجاب لايجوز له أن يشهد ولو فسّر للقاضين لايقبله، لأن النعمة تشبه النعمة فلم يحصل العلم۔ (ہدایہ: ۳/۱۵۸)

(۲) إلا إذا كان دخل البيت وعلم أنه ليس فيه أحد سواه ثم جلس على الباب وليس في بيته مسلك غيره فسمع اقرار الداخل ولايراه، له أن يشهد لأنه حصل العلم في هذه الصورة۔ (ہدایہ: ۳/۱۵۸)

(۳) (امداد الفتاویٰ: ۳/۷ ۴۳)

(۴) (لا) تقبل (من أعمى) أي لايقضي بها ولو قضى صح وعم قوله ←

۴۳۹- **ضابطہ**: ہر ایسی شہادت جو شاہد کے لئے نفع کھینچ کر لائے یا اس سے کسی تاوان کو دور کرے وہ مقبول نہیں (کیونکہ اس میں تہمت کذب کی گنجائش ہے)[1]

تفریعات:

(۱) پس اصول (ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی اوپر تک) کی شہادت اپنے فروع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی نیچے تک کی تمام اولاد) کے حق میں قبول نہ ہوگی، اسی طرح فروع کی شہادت اپنے اصول کے حق میں قبول نہ ہوگی۔[2]

(۲) زوجین (میاں بیوی) کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں قبول نہ ہوگی۔[3]

اور اصول وفروع کے علاوہ دوسرے اقرباء جو شاخوں میں پھیلے ہوئے ہیں جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی خالہ، ماموں، وغیرہ ان کے حق میں شہادت معتبر ہے، کیونکہ ان کے مال کا نفع مذکور رشتہ داروں کی طرح عرفاً وعادتاً عام نہیں پس ان کو اجانب کے ساتھ لاحق کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ ان رشتہ داروں کو زکوۃ دینا درست ہے برخلاف اصول وفروع کے۔[4]

→ (مطلقاً) مالو عمي بعد الأداء قبل القضاء وما جاز بالسماع، خلافاللثاني۔ (الدر المختار) وفي الشامية: قوله: (أي لايقضي بها) خلافاً لأبي يوسف فيما إذا تحمله بصير أفإنها تقبل لحصول العلم بالمعاينة۔ (شامی: ۸/۱۹۳، زکریا دیوبند، اللباب في شرح الكتاب: ۴/۶۰، شاملة)

(۱) وأصله أن كل شهادة جرت مغنماً أو دفعت مغرماً لم تقبل لأنها تمكنت فيها تهمة الكذب، والشهادة المتهمة مردودة۔ (معين الأحكام للطرابلسي: ۸۴- هكذا في قاضيخان على الهنديه: ۲/۴۶۶)

(۲) (بدائع الصنائع: ۵/۴۰۹) (۳) (الحوالة السابقة)

(۴) وأما سائر القرابات كالأخ والعم والخال ونحوهم: فتقبل شهادة بعضهم لبعض لأن هؤلاء ليس لبعضهم تسلط في مال البعض عرفا وعادة فالتحقوا بالأجانب۔ (بدائع: ۵/۴۰۹- هكذا في الهنديه: ۳/۴۷۰)

(۳) کاروبار میں دو شریک (پارٹنرز) کی شہادت مال شرکت سے متعلق ایک دوسرے کے حق میں معتبر نہ ہوگی۔[1]

(۴) اجیر کی شہادت مستاجر کے حق میں اجرت سے متعلق معاملہ میں معتبر نہیں۔[2]

(۵) مقدمہ میں وکیل کی شہادت موکل کے حق میں معتبر نہیں۔[3]

(۶) یتیم کی پرورش کرنے والے کی شہادت یتیم کے حق میں قابل قبول نہیں۔[4]

(۷) اسی طرح اگر ورثاء سب نابالغ ہوں یا کچھ نابالغ ہوں تو وصی کی شہادت اس بات پر کہ میت کا فلاں کے ذمہ قرض ہے معتبر نہیں۔[5]

کیونکہ ان سب صورتوں میں شہادت سے خود شاہد کو نفع پہنچتا ہے۔

اور تاوان دور کرنے سے متعلق تفریعات یہ ہیں:

(۸) کفیل بالمال کی شہادت اس بات پر کہ اصیل (مدیون) نے مال مکفول بہ ادا کر دیا ہے قابل قبول نہ ہوگی، کیونکہ اس شہادت سے وہ اور اصیل دونوں دین سے بری ہوجاتے ہیں، تو گویا کفیل شہادت کے ذریعہ خود کو ضمان سے بچانا چاہتا ہے۔[6]

---

(۱) ولا تقبل شهادة أحد الشريكين لصاحبه في مال الشركة۔ (بدائع: ۵/۴۱۰ –هكذا في الهنديه: ۳/۴۷۱)

(۲) وكذا لاتقبل شهادة الأجير له في الحادثة اللتي استأجره فيها لما فيه من تهمة جر النفع إلى نفسه۔ (الحوالة السابقة)

(۳،۴) وعلى هذا تخرج شهادة الوصي للميت واليتيم اللذى في حجره لأنه خصم فيه، وكذا شهادة الوكيل لموكله۔ (الحوالة السابقة)

(۵) إذا شهد الوصي بدين للميت والورثة صغار أو بعضهم صغار لاتقبل شهادته لأنه يثبت بشهادته حق نفسه۔ (قاضيخان على الهنديه: ۲/۴۶۶)

(۶) لاتقبل شهادة الكفيل بالمال للأصيل على كون المكفول به قد تأدى الواردة في هذه المادة حيث إن الأصيل بهذه الشهادة والكفيل بموجب المادة (۶۶۵) يبرأ من الدين فيكون قد خلّص نفسه من الضمان بالشهادة۔ (درر ←

(۹) ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میت کے ذمہ میرے ایک لاکھ روپے ہیں، اور ابھی اس نے اپنا دعویٰ بینہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا کہ ورثاء میت میں سے دو وارثوں نے دیگر وارثین کی اجازت کے بغیر اسے ایک لاکھ روپے دیدئے، پھر یہ دونوں وارث مدعی کے مذکور دعویٰ پر گواہی دینے لگے تو ان کی گواہی معتبر نہ ہوگی، کیونکہ اثبات دعویٰ سے پہلے ان دو وارثوں کا مشترک ترکہ میں سے رقم ادا کرنا موجب ضمان ہے یعنی باقی ورثاء کے حصہ کا ان پر ضمان آتا ہے، تو اب مدعی کے حق میں ان کا شہادت دینا اس بات کا اتہام پیدا کردے گا کہ یہ دونوں اپنے اوپر آنے والے ضمان کو دفع کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا ان کی گواہی مقبول نہ ہوگی (ہاں اگر مدعی کو قرض ادا کرنے سے پہلے شہادت دیتے تو ان کی شہادت مقبول ہوتی، کیونکہ ادا سے قبل ضمان نہ آتا تو جو مانع شہادت ہے یعنی دفع ضمان کا اتہام وہ نہ پایا جاتا) (۱)

۴۴۰- **ضابطہ:** دشمن کے خلاف گواہی میں اگر دشمنی دنیوی امور (مال، منصب، جاہ وغیرہ) سے متعلق ہے تو معتبر نہیں، اور اگر دینی امور سے متعلق دشمنی ہے (مثلاً وہ بدعت کرتا ہے یا کوئی خلاف شرع کام کرتا ہے اس لئے جائز حد تک اس سے عدم تعلق وعداوت رکھتا ہے) تو معتبر ہے۔ (۲)

← الحكام في شرح مجلة الأحكام: ۲ / ۱۴۸)

(۱) إذا دعى الدائن ألف درهم من المتوفي وقبل أن يثبت دعواه بالشهود أدى اثنان من الورثة ذالک المبلغ للدائن من التركة ثم شهدا على دعواه المذكورة فلا تقبل شهادتهما، لأن إعطاهما المبلغ المذكور من التركة بلا إثبات يوجب عليهما ضمان حصة باقي الورثة فكان في هذه الشهادة دفع مغرم عنهما أما إذا شهدا على ذالک قبل أداء الدين فتقبل شهادتهما۔ (درر الحكام في شرح مجلة الأحكام: ۲ / ۱۴۸)

(۲) ولا تجوز الشهادة الرجل على الرجل إذا كان بينهما عداوة، قالوا هذا ←

۴۴۱-**ضابطہ**: کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف قابل قبول نہیں۔[۱]

تشریح: کیونکہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا} البتہ کافر کی گواہی کافر کے خلاف معتبر ہے۔

۴۴۲-**ضابطہ**: جو شہادتیں حقوق اللہ سے متعلق ہیں (جیسے طلاق، ایلاء، ظہار، عتق، اسباب حرمت، حد زنا، حد خمر، وقف، ثبوت رمضان وغیرہ) ان میں دعویٰ ضروری نہیں، مدعی کے دعویٰ کے بغیر بھی شاہد شہادت دے سکتا ہے۔ اور جو شہادتیں حقوق العباد سے متعلق ہیں (جیسے کسی کی کچھ ملکیت ثابت کرنا وغیرہ) ان میں دعویٰ ضروری ہے، مدعی کے دعویٰ کے بغیر ان میں شاہد کی شہادت معتبر نہ ہوگی۔[۲]

تشریح: حقوق العباد بندوں کے مطالبہ پر موقوف ہیں اور مطالبہ دعویٰ سے ظاہر ہوگا پس ان میں دعویٰ ضروری ہے، برخلاف حقوق اللہ کے کہ ہر شخص ان کو بجالانے کا مکلف ہے اور ہر ایک ان میں خصم ہے، پس گویا ان میں ہر وقت دعویٰ غیر حسی طور پر موجود رہتا ہے۔[۳]

۴۴۳-**ضابطہ**: تنہا عورتوں کی شہادت بغیر مرد کے مقبول نہیں اگر چہ عورتیں

← إذا كانت العداوة بينهما بسبب شيء من الدنيا فأما إذا كانت بسبب شيء من أمر الدين فإنه تقبل شهادته عليه (قاضی خاں مع الہندیہ: ۲/ ۴۶۱ - شامی: ۸/ ۱۹۸- ۱۹۹)

---

(۱) شهادة أهل الذمة ليست بحجة على المسلمين۔ (قواعد الفقہ ص: ۸۵ قاعدہ: ۱۵۵)　(۲) الشهادة على حقوق العباد لاتقبل بلادعوى بخلاف حقوق الله (قواعد الفقہ، ص: ۸۶، قاعدہ: ۱۵۷ - شامی: ۸/ ۱۷۵)

(۳) تقدم الدعوى في حقوق العباد شرط قبولها لتوقفها على مطالبتهم ولو بالتوكيل، بخلاف حقوق الله لوجوب إقامتها على كل أحد، فكل احد خصم فكأن الدعوى موجودة۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۲۰۹)

کثیر تعداد میں ہوں۔ (۱)

استثناء: مگر عورتوں کے مخصوص امور جن پر عموماً مرد آگاہ نہیں ہوسکتے مثلاً پردۂ بکارت کا باقی یا زائل ہونا، حیض کا جاری و بند ہونا، حمل کا ہونا نہ ہونا یا جسم میں ستر کے حصے میں کوئی عیب ہونا وغیرہ مستثنیٰ ہیں کہ ان میں تنہا ایک عورت کی گواہی بھی (جبکہ عادل ہو) معتبر ہے، اور دو عورتیں ہونا احوط ہے ـــــ اسی طرح تنہا دائی کی شہادت بچے کے نسب کے متعلق یا بچے کے رونے اور حرکت کے متعلق [تاکہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جاسکے] معتبر ہے، کہ یہ اخبار کے قبیل سے ہے۔

البتہ میراث اور حرمت رضاعت کے سلسلہ میں تنہا دائی کی گواہی معتبر نہیں، اس میں نصاب شہادت شرط ہے۔ (۲)

فائدہ: عورتوں کے مخصوص امور میں مرد کی گواہی بھی معتبر ہے، چنانچہ اگر کوئی مرد کہے کہ میری اتفاقی نظر اس کے ستر پر عورت پر پڑگئی اور میں نے اس میں یہ عیب دیکھا تو اگر وہ عادل ہے تو اس کی بات معتبر ہوگی۔ (۳)

---

(۱) و لا تقبل شهادة النساء بانفرادهن الخ (تاتارخانیہ: ۲۱۹/۱۱، م: ۱۶۴۹۰)

(۲) ومنها الشهادة في الولادة والبكارة وعيوب النساء فيما لا يطلع عليه الرجال وتقبل فيها شهادة امرأة واحدة مسلمة حرة عدلة والثنتان احوط، هكذا في فتح القدير۔ (ہندیہ: ۴۵۱/۳) إلا شهادة القابلة على الولادة فإنها مقبولة في حق النسب دون الميراث، وكذالك شهادة القابلة على الاستهلال مقبولة في حق الصلاة عليه دون غيره لمكان الضرورة (قاضیخان مع الهندیه: ۴۵۹/۲) ولا تقبل في الرضاع شهادة النساء منفردات وإنما يثبت بشهادة رجلين أو رجل وامرأتين۔ (قدوری: ۱۷۰)

(۳) ولو شهد بذالك رجل بأن قال فاجأتها فاتفق نظري فالجواب أن لا يمتنع قبول شهادته إذا كان عدلا في مثل هذا الموضوع۔ (ہندیہ: ۴۵۱/۳)

۴۴۴-**ضابطہ**: حدود وقصاص کی شہادت میں گواہوں کا مرد ہونا ضروری ہے۔[۱]

تشریح: پس حدود وقصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہ ہوگی، کیونکہ حدود وقصاص میں ایک گونہ دہشت وسختی ہے، اور عورت فطرتاً کمزور ہے اس لئے شریعت نے اس کی رعایت میں اس پر شہادت کا بوجھ نہیں ڈالا ہے۔

فائدہ: حدود وقصاص کے علاوہ باقی تمام شہادات جیسے نکاح، طلاق، عدت، رجعت، خلع، اسلام، ارتداد، ثبوت نسب، خرید وفروخت، شرکت، حوالہ، کفالہ، وکالت اور تمام مالی امور میں دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قابل قبول ہوگی۔[۲]

۴۴۵-**ضابطہ**: گواہ کا عادل ہونا وجوب شہادت کے لئے شرط ہے نہ کہ صحت شہادت کے لئے۔[۳]

تشریح: یعنی گواہ جب عادل ہوں تو قاضی پر ان کی گواہی قبول کرنا واجب ہے، انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن صحت شہادت کے لئے گواہ کا عادل ہونا شرط نہیں، بلکہ اگر قاضی تحری کرکے فاسق کی شہادت پر بھی فیصلہ کردے تو نافذ ہوجائے گا (مگر یہ کہ امام المسلمین قاضی کو اس سے منع کردے تو پھر اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا)[۴]

(۱) وأما أقسام الشهادة فمنها الشهادة على الزنا... ومنها الشهادة ببقية الحدود القصاص تقبل فيها شهادة رجلين ولا تقبل في هذين القسمين شهادة النساء هكذا في الهداية۔ (هنديه: ۳/ ۴۵۱)

(۲) (تاتارخانیہ: ۱۱/ ۴۱۹، م: ۱۶۴۸۹، البحر الرائق: ۷/ ۱۰۴)

(۳) والعدالة لوجوبه لا لصحته۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۸/ ۱۷۸)

(۴) فلو قضى بشهادة فاسق نفذ وأثم، إلا أن يمنع منه أي من القضاء بشهادة الفاسق الإمام فلا ينفذ۔ (الدر المختار) قال في جامع الفتاوى: وأما شهادة الفاسق فإن تحرى القاضي الصدق في شهادته تقبل وإلا فلا۔ (شامی: ۸/ ۱۷۸، بدائع: ۵/ ۴۰۷)

درمختار میں بزازیہ کے حوالہ سے امام ابو یوسف کا یہ مسلک منقول ہے کہ اگر عادل گواہ نہ ہونے کی وجہ سے حق تلفی کا اندیشہ ہو اور فاسق شخص ذی وجاہت ہو جس کے صدق کا ظن غالب ہو تو قاضی اس کی شہادت قبول کرلے اور یہ قبول کرنا واجب ہے۔[۱]

فائدہ: عدالت کے معنی عام فقہاء کے یہاں یہ ہیں کہ اس نے کبھی گناہ کبیرہ نہ کیا ہو اور اگر کیا ہو تو اس سے توبہ کرلی ہو اور اس کے حالات سے پتا چلتا ہو کہ وہ اپنی توبہ میں صادق ہے، نیز صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو، کیونکہ صغیرہ پر اصرار سے وہ گناہ کبیرہ ہو جاتا ہے، پس جس شخص میں یہ چیز ہو وہ عادل ہے۔[۲]

اور مراد عدالت سے عمل میں عدالت ہے عقائد میں نہیں، پس بدعتی، غیر مقلد، مودودی وغیرہ کی شہادت -باوجودیکہ وہ عقائد میں فاسق ہیں- جبکہ عملاً عادل ہوں مقبول ہے، البتہ اس میں شرط ہے کہ وہ خلاف حق عقیدہ موجب کفر نہ ہو۔[۳]

۴۴۶-**ضابطہ**: حدود وقصاص میں گواہوں کا تزکیہ ضروری ہے، دیگر امور میں ضروری نہیں۔

(یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے، صاحبین کے نزدیک تمام امور میں تزکیہ ضروری ہے)[۴]

---

(۱) واستثنى الثاني الفاسق ذالجاه والمروءة فانه يجب قبول شهادته۔ (الدر المختار: ۸/ ۲۶- والتفصيل فى الشامية)

(۲) (شامی: ۸/ ۱۷۸، بدائع: ۵/ ۴۰۲)

(۳) وتقبل من أهل الهواء أى اصحاب بدع لاتكفر كجبر۔الخ (الدر المختار) وفى الشامية: انما تقبل شهادتهم لأن فسقهم من حيث الاعتقاد وما أوقعهم فيه الا التعمق والغلو فى الدين والفاسق انما ترد شهادته بتهمة الكذب ... فمن وجب اكفاره منهم فالأكثر على عدم قبوله۔ (شامی: ۸/ ۱۸۸)

(۴) (بدائع الصنائع: ۵/ ۴۰۵، الدر المختار: ۸/ ۱۷۹، ھندیہ: ۳/ ۵۲۷)

تشریح: تزکیہ سے مراد: گواہوں کے متعلق جبکہ قاضی کو شک ہو یا خصم دعویٰ کرے یہ تحقیق کرنا ہے کہ وہ عادل ہیں یا نہیں؟۔ یہ تحقیق حدود وقصاص میں تو بالاتفاق ضروری ہے، کیونکہ حدود وقصا کا معاملہ بہت احتیاط چاہتا ہے، دیگر امور میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ضروری نہیں، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک تمام معاملات میں تزکیہ وتحقیق ضروری ہے۔

یہ اختلاف: اختلاف زمانی ہے نہ کہ برہانی، کیونکہ امام صاحبؒ کا زمانہ قرن ثالث ہے جو حدیث کی رو سے خیر القرون ہے، اس میں دیانت عام تھی اس لئے گواہان کے تزکیہ کی ضرورت نہیں تھی، صرف ظاہر پر اعتماد کافی تھا، برخلاف صاحبینؒ کا زمانہ کہ وہ قرن رابع ہے، خیر القرون میں سے نہیں ہے، ان کے زمانہ میں لوگوں کی دیانت میں کافی فرق آگیا تھا اس لئے صاحبینؒ نے تمام امور میں تزکیہ ضروری قرار دیا، اب فتویٰ اسی قول پر ہے۔[1]

پھر جاننا چاہئے کہ تزکیہ دو طرح سے ہوتا ہے ایک: تزکیہ سر، دوسرا: تزکیہ علانیہ تزکیہ سریہ ہے کہ: قاضی خاموشی سے گواہوں کے قرب وجوار میں کسی معتبر وبااہل شخص کو بھیج دے جو گواہوں کی عدالت وثقاہت کی تحقیق کرے اور آکر اپنی خفیہ رپورٹ قاضی کو پیش کرے۔ اس تحقیق کے لئے دو شخصوں کا ہونا ضروری نہیں، ایک معتبر شخص

---

(۱) وقيل هذا اختلاف عصر وزمان والفتوىٰ على قولهما في هذا الزمان۔ (ہدایہ: ۳/ ۱۵۷-) هذا اختلاف عصر وزمان لا اختلاف حجة وبرهان، لأن عصره مشهور بالخير لكونه قرنا ثالثا وعصرهما مسكوت عنه لكونه قرنا رابعا إذ فشا فيه الكذب لتغير أحوال الناس (وبه) أي بقول الإمامين (يفتى في زماننا) لأن الفساد في هذا العصر أكثر كما في أكثر المعتبرات ۔ مجمع الانهر: ۲/ ۱۸۹ ، الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۱۷۹ ، المبسوط للسرخسي: ۱۶/ ۸۸ ، شاملة)

بھی کافی ہے، البتہ احتیاط یہ ہے کہ دو شخص سے کم نہ ہو۔[1] اور تزکیہ علانیہ یہ ہے کہ: قاضی برسرعام گواہوں کی ثقاہت کے متعلق شہادت طلب کرے اور کچھ لوگ آکر یہ شہادت دیں کہ وہ ثقہ ومعتبر ہے۔ اس تزکیہ میں مزکیین میں شہادت کی تمام شرائط (سوائے لفظ شہادت کے) پایا جانا، نیز نصاب شہادت یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔[2]

پھر بعد کے زمانہ میں چونکہ تزکیہ علانیہ میں فتنہ کا اندیشہ تھا، اس لئے فقہاء نے تزکیہ سر پر اکتفاء کا حکم دیا اور تزکیہ علانیہ سے منع کیا۔[3]

۲۴۷- **ضابطہ**: محدود فی القذف کی شہادت توبہ کے بعد بھی مقبول نہیں، برخلاف دیگر محدودین کے۔[4]

تشریح: قذف کے معنی پھینکنے کے ہے، اصطلاح میں قذف کے معنی کسی پر زنا کی تہمت لگانا ہے، پس محدود فی القذف: وہ شخص ہے جس نے کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی ہو جس کی وجہ سے اس پر ۸۰ رکوڑے حد جاری کی

---

(۱) یکفی فی التزکیة السریة مزکٍّ واحد إلا أنه رعایة للاحتیاط یجب أن لایکون المزکّي أقل من اثنین۔ (درر الحکام فی شرح مجلة الأحکام: ۴ / ۲۵۷، مادة: ۱۷۲۱)

(۲) التزکیة العلنیة من قبیل الشهادة وتعتبر فیها شروط الشهادة ونصابها ولکن لایلزم علی المزکین ذکر لفظ الشهادة (الحوالة السابقة: ۴/۲۵۸، مادة: ۱۷۲۲)

(۳) وقد کانت العلانیة وحدها فی الصدر الأول ووقع الاکتفاء فی السر فی زماننا تحرزاً عن الفتنة ویروی عن محمد تزکیة العلانیة بلاء وفتنة (ہدایہ: ۳/۱۵۷)

(۴) ومنها أن لایکون محدوداً فی قذف عندنا وهو شرط الأداء... وأما المحدود فی الزنا والسرقة والشرب فتقبل شهادته بالإجماع إذا تاب لأنه صار عدلاً۔ (بدائع: ۵/۴۰۷-۴۰۹)

گئی ہو۔

شرعاً ایسے شخص کی گواہی بالکل مقبول نہیں اگر چہ توبہ کرلے، کیونکہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا (ایسوں کی شہادت کبھی قبول نہ کرنا) پس اس کی شہادت قبول نہ کرنا اس کی سزا کا جزء ہے۔

برخلاف اگر کسی کو زنا، چوری یا شراب کے جرم میں حد لگائی گئی ہو، تو اس کی شہادت توبہ کے بعد مقبول ہے۔[1]

البتہ محدود فی القذف کو نکاح میں (یعنی انعقاد نکاح میں) گواہ بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس وقت مقصود نکاح کی تشہیر ہے جو اس سے حاصل ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے نکاح میں تو اندھا اور فاسق شخص بھی گواہ بن سکتا ہے۔ البتہ اثبات نکاح میں (یعنی نکاح کے انکار کے وقت قاضی کی عدالت میں نکاح کو ثابت کرنے میں) اس کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔[2]

۴۴۸- **ضابطہ:** شہادت کو جبکہ حق ضائع ہوتا ہو چھپانا جائز نہیں، مگر حدود میں چھپانا بہتر ہے۔[3]

تشریح: یعنی اگر واقعہ کی تحقیق اس کی شہادت پر موقوف ہو اور وہ شہادت نہ دے تو بندے کا یا اللہ کا حق ضائع ہوگا تو شہادت دینا واجب ہے، اگر نہیں دے گا تو گنہ گار ہوگا، خصوصاً جبکہ اس سے مطالبہ بھی کیا جائے۔[4]

---

(۱) (بنایہ فی شرح الہدایہ: ۸/ ۱۶۳) (۲) (البحر الرائق: ۳/ ۱۵۸)

(۳) (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۸/ ۱۷۴-۱۷۶- بنایہ فی شرح الہدایہ: ۸/ ۱۲۱)

(۴) إذا شهد على شيء ثم امتنع عن اداء الشهادة إن علم أنه لو لم يشهد يذهب حق المشهود له فلم يشهد يصير فاسقاً۔ (تاتارخانیہ: ۱۱/ ۳۹۹) وتلزم بطلب المدعي أي يلزم أدائها الشاهد إذا طلبه المدعى فيحرم كتمانها لقوله تعالى {ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه} [البقرة: ۲۸۳] (البحر الرائق: ۷/ ۹۶)

البتہ وہ جرائم جن میں حد واجب ہوتی ہے، جیسے زنا، چوری، شراب نوشی، اتہام تو ان میں ایک مسلمان کے ساتھ ستر اور پردہ پوشی سے کام لینا شہادت دینے سے بہتر ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ہزالؓ کو فرمایا تھا کہ اگر تم اپنے بھائی کو اپنے کپڑے میں چھپا لیتے (یعنی اس کے جرم پر پردہ ڈالتے) تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوتا۔ [۱]

فائدہ : چوری کے معاملہ میں فقہاء نے لکھا ہے، قاضی کے پاس جا کر چور کے متعلق کہے اس نے فلاں کا مال لیا ہے، تا کہ صاحب حق (جس کا مال چوری ہوا ہے) کا حق ضائع نہ ہو نیز چوروں کی حوصلہ شکنی بھی ہو، لیکن یہ نہ کہے کہ اس نے چوری کی ہے تا کہ حد جاری نہ ہو اور حدود میں ستر - جو کہ افضل ہے - پر عمل ہو جائے، نیز اس لئے بھی کہ اگر چوری کی شہادت دے گا تو قطع ید ہوگا اور چور پر ضمان نہیں آئے گا، کیونکہ قطع اور ضمان دونوں جمع نہیں ہوتے تو صاحب حق کو اپنا حاصل نہ ہوگا۔ [۲]

۴۴۹- **ضابطہ:** شہادت علی الشہادت ان تمام چیزوں میں جائز ہے جو شبہ سے ساقط نہیں ہوتیں اور جو شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں [اور وہ حدود و قصاص ہیں] ان میں جائز نہیں۔ [۳]

تشریح: شہادت علی الشہادت کا مطلب ہے: اصل گواہ کا دوسرے کو گواہ بنانا

---

(۱) وسترها في الحدود أحب لقوله عليه الصلاة والسلام للذي شهد عنده "لو سترته بثوبك لكان خيرا لك" والمخاطب هزال۔ (البحر الرائق: ۷/۹۹)

(۲) ويقول في السرقة أخذ لاسرق إحياء الحق المسروق منه ولايقول سرق محافظة على الستر ولأنه لو ظهرت السرقة لوجب القطع والضمان لايجامع القطع فلايحصل إحياء حقه (البحر الرائق: ۷/۱۰۱، تاتارخانیہ: ۱۱/۳۹۹)

(۳) والشهادة على الشهادة جائزة في كل حق لايسقط بالشبهة، والاتقبل في الحدود والقصاص، لأنها تسقط بالشبهة۔ (اللباب فی شرح الکتاب: ۲/۱۵۱)

تاکہ وہ قاضی کی مجلس میں جاکر اس کی طرف سے گواہی دے۔

قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ بالکل جائز نہ ہو کیونکہ شہادت کا ادا کرنا عبادت بدنیہ ہے اور عبادت بدنیہ میں نیابت جاری نہیں ہوتی، لیکن فقہاء نے استحسانا اس کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ بسا اوقات اصل گواہ کی موت، یا سخت بیماری، یا سفر میں ہونے یا پردہ نشین خاتون ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ لوگوں کے بہت سے حقوق ضائع ہوجائیں گے، پس مذکور مجبوری میں شہادت علی الشہادت جائز ہے۔

لیکن چونکہ شہادت علی الشہادت میں بدلیت کا شبہ بھی ہے اس لئے یہ ان چیزوں میں جو شبہ سے ساقط ہوجاتی ہیں [اور وہ حدود وقصاص ہیں] جائز نہیں۔ (۱)

فائدہ: شہادت علی الشہادت میں ضروری ہے کہ اصل گواہ اپنی طرف سے دو مرد (یا ایک مرد اور دو عورتوں) کو گواہی کیلئے مقرر کریں جب ہی نیابت معتبر ہوگی، اور ان دو کی بالواسطہ شہادت سے اب بھی ایک ہی گواہ کی ضرورت پوری ہوگی۔

البتہ دو گواہوں کی طرف سے چار شخصوں کا ہونا ضروری نہیں، دو کی گواہی بھی کافی ہے، کیونکہ اس صورت میں شہادت جملہ حقوق پر ہوگی، گویا ان دو نائبوں نے اولاً ایک گواہ کی طرف سے حق ادا کیا پھر دوسرے کی طرف سے حق ادا کیا اور دو شخصوں کا دو حق پر شہادت دینا جائز ہے۔ برخلاف ایک کی طرف سے ایک کی شہادت، کہ وہ کافی نہیں کیونکہ فرد کی گواہی حق ثابت نہیں کرسکتی۔ حاصل یہ کہ دو گواہوں کی طرف سے دو شخصوں کی نیابت تو جائز ہے، لیکن ایک گواہ کی طرف سے ایک کی نیابت جائز نہیں، اس میں بھی دو کا ہونا ضرور ہے۔ (۲)

(۱) (درر الحکام شرح غرر الأحکام: ۸/۲۹۲-الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۸/۲۲۵)

(۲) (یجوز شهادة شاهدین أو رجل وامرأتین علی شهادة شاهدین لأن نقل الشهادة من جملة الحقوق وقد شهدا بحق ثم بحق آخر فتقبل، لأن شهادة ←

۴۵۰- **ضابطہ**: دعویٰ سے زیادہ کی شہادت باطل ہے- خواہ زیادتی حقیقتاً ہو یا معناً- برخلاف دعویٰ سے کم کی شہادت کہ وہ مقبول ہے-[1]

جیسے:

(۱) مدعی نے کسی کے ذمہ ایک ہزار کا دعویٰ کیا اور اس کے گواہوں نے دو ہزار کی گواہی دی تو مقبول نہ ہوگی کہ اس میں حقیقتاً دعویٰ سے زیادہ کی شہادت ہے (البتہ اگر اس صورت میں مدعی شہادت اور دعویٰ میں تطابق پیدا کردے- مثلاً میرے دو ہزار باقی تھے مگر ایک ہزار وصول ہوگئے اور اب ایک ہزار ہی باقی ہے، یا کہے میں نے ایک ہزار معاف کردئے تھے- تو پھر وہ گواہی مقبول ہوگی)

اور اگر دعویٰ سے کم کی شہادت ہو جیسے دو ہزار کا دعویٰ کیا اور شہادت ایک ہزار کی دی تو ایک ہزار کی حد تک شہادت مقبول ہوگی-

(۲) کسی نے گھر پر مطلق ملکیت کا دعوی کیا یعنی کہا اس گھر کا میں مالک ہوں اور ملکیت کا سبب بیان نہیں کیا یعنی میں نے اس کو خریدا ہے یا وراثت میں ملا ہے یا ہدیہ میں آیا ہے وغیرہ کوئی سبب ملکیت کا ذکر نہیں کیا اور اس کے شاہدوں نے گواہی دی کہ یہ گھر اس نے فلاں سے خریدا ہے (یعنی ملک بسبب کی گواہی دی) تو یہ شہادت مقبول ہے، کیونکہ دعویٰ میں معناً زیادتی ہے اور شہادت میں کمی ہے؛ اس طرح کہ شاہدوں کی شہادت ملک کے ایک سبب (خریدنے) پر منحصر ہے، جبکہ مدعی کا دعویٰ کسی ایک سبب کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ سبب بھی ہوسکتا ہے جو شاہدوں نے ذکر کیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور سبب بھی —— اور اگر امر برعکس ہو یعنی مدعی ملک بسبب کا دعویٰ کرے اور

← الشاهدين على حقين جائزة- ولا تقبل شهادة واحد على شهادة واحد، لأن شهادة الفرد لا تثبت الحق- (اللباب في شرح الكتاب: ۲/۱۵۱)

(۱) الشهادة باكثر من المدعي باطلة بخلاف الأقل- (قواعد الفقہ ص:۸۶، قاعدہ: ۱۵۶- شامی: ۸/۱۷۵)

گواہان ملک مطلق کی گواہی دیں تو شہادت مقبول نہ ہوگی، کیونکہ دعویٰ میں معناً کمی اور شہادت میں زیادتی ہے (البتہ سبب ارث اس سے مستثنیٰ ہے یعنی مدعی بسبب وراثت ملکیت کا دعویٰ کرے اور گواہان ملک مطلق کو بیان کرے تو یہ گواہی مقبول ہے اس لئے کہ سبب وراثت بمقابل دوسرے اسباب کے قوی ہے پس دعویٰ اور شہادت میں معناً برابری ہوگئی)(۱)

(۳) اسی طرح اگر کسی نے نتاج کا دعویٰ کیا یعنی یہ بچہ اسی بھینس نے جنا ہے اور اس بھینس پر اس کی ملکیت مسلّم ہو اور گواہان ملک مطلق کی گواہی دیں تو ان کی گواہی معتبر ہوگی، کیونکہ نتاج کے دعویٰ میں جبکہ بھینس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے بچہ پر ملکیت بالیقین ثابت ہوگی، اور مطلق شہادت میں اتنا یقین کا معنیٰ نہیں ہے، پس دعویٰ میں معناً زیادتی اور شہادت میں کمی پائی گئی اس لئے شہادت مقبول ہے —— اور اگر برعکس صورت ہو یعنی مدعی مطلق ملک کا دعویٰ کرے اور گواہان نتاج کی گواہی دیں تو حکم بھی برعکس ہوگا۔(۲)

۴۵۱- **ضابطہ:** دونوں گواہوں کی شہادت میں لفظاً ومعناً موافقت ضروری ہے۔(۳)

(۱-۲) ومنه إذا دعى ملكاً مطلقاً أو بالنتاج فشهدوا في الأول بالملك بسبب وفي الثاني بالملك المطلق قبلت، لأن الملك بسبب أقل من المطلق لأنه يفيد الأولوية بخلافه بسبب فإنه يفيد الحدوث، والمطلق أقل من النتاج لأن المطلق يفيد الأولوية على الاحتمال والنتاج على اليقين، وفي قلبه: وهو دعوى المطلق فشهدوا بالنتاج لاتقبل، ومن الأكثر مالو ادعى الملك بسبب فشهدوا بالمطلق لاتقبل إلا إذا كان السبب الإرث۔ (شامی: ۸/ ۲۱۵)

(۳) تجب موافقة الشهادتين لفظا ومعنى۔ (قواعد الفقه: ۷۷، قاعده: -۷۷ بدائع الصنائع: ۵/ ۴۱۱)

تشریح بمعنا موافقت تو ظاہر ہے، لفظاً موافقت سے مراد: امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دونوں لفظ اپنی وضع کے اعتبار سے ایک معنی میں متحد ہوں، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک باعتبار وضع موافقت ضروری نہیں، بلکہ تضمنا بھی اگر دونوں لفظ معنی کے موافق ہوں تو کافی ہے۔ (۱)

تفریعات:

(۱) پس اگر ایک گواہ نے تزویج کا لفظ کہا اور دوسرے نے نکاح کا یا ایک نے ہبہ کا اور دوسرے نے عطیہ کا لفظ کہا تو بالاتفاق یہ شہادت مقبول ہوگی، کیونکہ تزویج اور نکاح اسی طرح ہبہ اور عطیہ آپس میں مترادف الفاظ ہیں جو ایک ہی معنی کیلئے وضع کئے گئے ہیں، اور لفظوں کا ایسا اختلاف درحقیقت اختلاف شمار نہیں ہوتا۔ (۲)

(۲) اور اگر ایک نے شہادت دی کہ فلاں کے ذمہ اس کے دو ہزار روپے ہیں اور دوسرے نے کہا پندرہ سو ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ شہادت مقبول نہ ہوگی، کیونکہ دو ہزار اور پندرہ سو دونوں وضع کے اعتبار سے مختلف معنی کو شامل ہیں تو دونوں کی شہادت میں موافقت نہ رہی۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک یہ شہادت پندرہ سو کے حق میں مقبول ہوگی، کیونکہ دو ہزار کا لفظ پندرہ سو کو متضمن ہے اس کے ضمن میں پندرہ سو آجاتے ہیں پس گو وضع کے اعتبار سے دونوں میں موافقت نہیں ہے، لیکن تضمناً موافقت موجود ہے اور اتنا کافی ہے (یہی حکم ہوگا جبکہ طلاق کی تعداد کے سلسلہ میں گواہوں میں اس طرح کا اختلاف ہو، یعنی امام صاحبؒ کے نزدیک وہ شہادت مقبول نہ ہوگی اور صاحبینؒ کے

---

(۱) وتجب موافقة الشهادتين لفظا ومعنى۔ (الدر المختار) واللذي يظهر من هذا أن الإمام اعتبر توافق اللفظين على معنى واحد بطريق الوضع وأن الإمامين اكتفيا بالموافقة المعنوية ولو بالتضمن ولم يشترطا المعنى الموضوع له كل من اللفظين۔ (شامی: ۸/۲۱۷-البحر الرائق: ۷/۱۸۴)

(۲) (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/۲۱۸)

نزدیک مقبول ہے)[1]

استدراک: لیکن شہادت علی القول مثلاً بیع، طلاق، وصیت وغیرہ میں زمان ومکان میں موافقت ضروری نہیں، صرف نفس واقعہ میں موافقت کافی ہے۔ چنانچہ اگر ایک گواہ کہے کہ اس نے اپنی بیوی کو کل طلاق دی تھی اور دوسرا کہے اس نے آج طلاق دی ہے، یا ایک کہے اس نے اپنے گھر میں طلاق دی تھی دوسرا کہے گھر سے باہر طلاق دی تھی یا ایک نے گواہی دی کہ فلاں مرنے والے نے جمعرات کو وصیت کی تھی اور دوسرا کہے اس نے جمعہ کو وصیت کی تھی تو (شہادت علی القول میں) اس طرح زمان ومکان کا اختلاف مضر نہیں، اس سے دونوں کا کلام مختلف نہ سمجھا جائے گا۔[2]

ہاں مگر یہ زمان ومکان کا اختلاف ایسا فاحش ہو کہ تطبیق دینا ممکن ہی نہ ہو تو پھر یہ اختلاف بھی معتبر ہوگا اور شہادت باطل ہوگی۔ جیسے دو شاہدوں میں سے ایک نے گواہی دی کہ اس نے اپنی بیوی کو یوم النحر میں دہلی میں طلاق دی تھی، اور دوسرے نے شہادت دی کہ اس نے اسی دن فلاں جگہ طلاق دی تھی اور کوئی ایسی جگہ بتائی جس کی مسافت دہلی سے (بذریعہ سواری بھی) ایک دن سے زائد ہے تو یہ شہادت باطل ہوگی کیونکہ یہ اختلاف فاحش ہے، اس میں تطبیق ممکن نہیں۔[3]

---

(۱)(البحر الرائق: ۱۸۲/۷ - الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۲۱۸/۸)

(۲) وذکرہ فی الکافی فقال: وإذا اختلف الشاھدان فی المکان أو الزمان فی البیع والشراء والطلاق والعتق والوکالة والوصیة ...تقبل الخ، والأصل ان المشھود به إذا کان قولاً کالبیع ونحوہ فاختلاف الشاھدین فیه فی الزمان أو المکان لا یمنع قبول الشھادۃ لأن القول مما یعاد ویکرر۔ (البحر الرائق: ۱۹۰/۷)

(۳) وفی فتح القدیر قبیل باب تفویض الطلاق معزیاً إلی کافی الحاکم: لو اختلفا فی الوقت أو المکان أو الزمان بأن شھد أحدھما أنه طلقھا یوم النحر بمکة والآخر أنه طلقھا فی ذالک الیوم بالکوفة فھی باطلة لتیقن کذب أحدھما ←

۴۵۲- **ضابطہ**: ایک گواہ قول کی اور دوسرا فعل کی شہادت دے تو قابل قبول نہیں۔ (۱)

تشریح: جیسے ایک نے گواہی دی کہ اس نے غصب کیا ہے اور دوسرے نے کہا اس نے میرے سامنے غصب کا اقرار کیا ہے، تو یہ شہادت مقبول نہ ہوگی، کیونکہ غصب کرنا ایک فعل ہے اور غصب کا اقرار قول ہے تو ایک کی شہادت فعل سے اور دوسرے کی قول سے متعلق ہوئی اور یہ قبول کے لئے مانع ہے۔ (۲)

یا جیسے زید نے ایک ہزار کا کسی پر دعویٰ کیا اور دو گواہوں نے زید کے حق میں گواہی دی، لیکن ایک گواہ نے کہا کہ زید نے اس کو قرض دیا تھا اور دوسرے نے کہا اس نے زید کے لئے قرض کا اقرار کیا تھا تو یہ شہادت معتبر نہ ہوگی، کیونکہ قرض دینا فعل ہے اور قرض کا اقرار قول ہے، تو دونوں کی شہادت میں اختلاف ہوگیا۔ (۳)

۴۵۳- **ضابطہ**: نفی کی شہادت قابل قبول نہیں۔ (۴)

تشریح: کیونکہ شہادت دعویٰ کے اثبات کے لئے ہوتی ہے، اور نفی میں یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ نیز نفی کی شہادت استصحاب حال پر مبنی ہوتی ہے یعنی گواہان یہ گواہی اس لئے دے رہے ہیں کہ وہ اس میں نفی کو جانتے تھے تو اب بھی اس میں نفی ہی ہوگی،

← ولو شهدا بذالک فی یومین متفرقین بینهما فی الأيام قدر مایسیر الراکب من الکوفة إلى مكة جازت شهادتهما ... وهذا أيضاً مفيد لقولهم إن الاختلاف في الزمان لايضر في الأقوال فيقال إلا إذا ذكر أمكانين متباعدين۔ (البحر الرائق: ۱۹۲/۷)

(۱) وكذا لاتقبل فی کل قول جمع مع فعل۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۲۱۸/۸)

(۲) (ہندیہ: ۵۰۳/۳)

(۳) (درر الحکام شرح مجلة الأحكام: ۲۱۱/۱۲- الدر المختار: ۲۱۸/۸)

(۴) الشهادة على النفي لاتقبل۔ (قواعد الفقه، ص: ۸۶، قاعدہ: ۱۵۸)

جبکہ بات اس کے خلاف بھی ہوسکتی ہے جو گواہوں کے علم میں نہ ہو اور استصحاب حال احناف کے یہاں حجت نہیں۔

نفی کی مثال: جیسے گواہوں نے یہ گواہی دی کہ فلاں نے اس کو قرض نہیں دیا ہے کیونکہ وہ جس دن جس جگہ قرض دینے کا دعویٰ کرتا ہے اس دن وہ اس جگہ موجود ہی نہیں تھا بلکہ ایک لمبے سفر پر تھا تو یہ گواہی معتبر نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر گواہوں نے کہا ہم نے اس مدعی سے کبھی جھوٹ نہیں سنا، یا مدعی علیہ نے وہ بات نہیں کہی یا وہ کام نہیں کیا جس کا اس پر دعویٰ کیا گیا ہے تو ان سب میں نفی کی شہادت ہے جو قابل قبول نہ ہوگی۔

البتہ اگر نفی متواتر ہو یعنی تمام لوگوں کو نفی ہی کا علم ہو اس کے خلاف کا علم نہ ہو مثلا سبھی لوگ یہ جانتے ہو کہ فلاں اس وقت اس جگہ موجود نہیں تھا بلکہ دوسری جگہ تھا اور شاہدوں نے اس نفی کی شہادت دی تو بوجہ تواتر یہ شہادت مقبول ہوگی (پس نفی بالتواتر کی صورت مستثنیٰ ہے)[1]

شہادت سے رجوع کا بیان

۴۵۴- **ضابطہ**: شہادت سے رجوع قاضی کے فیصلہ سے پہلے معتبر ہے،

---

(۱) المادة (۱۶۹۹): إنما جعلت البينة مشروعة لإظهار الحق فعليه لا تقبل الشهاد بالنفي الصرف كقول الشاهد: فلان ما فعل هذا الأمر والشيء الفلاني ليس لفلان، وفلان ليس بمدين لفلان، ولكن بينة النفي المتواتر مقبولة. مثلا لو ادعى أحد بأني أقرضت فلانا في الوقت الفلاني في المحل الفلاني كذا مقدارا من الدراهم وأثبت المدعى عليه بالتواتر أنه لم يكن في الوقت المذكور في ذلك المحل بل كان في محل آخر تقبل بينة التواتر ولا تسمع دعوى المدعي. (درر الحكام في شرح مجلة الأحكام: ۴۴۳/۱۲ مادة:- ۱۶۹۹ وهكذا في شرح الحموي على الأشباه: ۱۹۰/۲)

فیصلہ کے بعد معتبر نہیں۔

تشریح: پس فیصلہ سے پہلے رجوع کیا تو قاضی اس شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا، کیونکہ یہ رجوع معتبر ہے، البتہ اس تضاد بیانی اور جھوٹی شہادت کی وجہ سے وہ گواہ سزا کا مستحق ہوگا، یہاں تک کہ معاملہ کے کسی ایک جز سے رجوع کیا تو باقی اجزاء کے متعلق بھی اس کی گواہی معتبر نہ ہوگی کیونکہ خود اس نے اپنی اس تضاد بیانی سے اپنا فاسق ہونا ظاہر کر دیا۔

اور قاضی کے فیصلہ کے بعد رجوع کیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، فیصلہ علی حالہ باقی رہے گا، اب رجوع سے قاضی کا فیصلہ نہیں ٹوٹے گا، البتہ اس صورت میں بھی وہ گواہ تعزیر کا مستحق ہے۔ (۱)

۴۵۵- **ضابطہ**: جھوٹی شہادت سے گواہوں پر تاوان اس وقت واجب ہوگا جبکہ بعینہ مال تلف ہوا ہو، منافع کے تلف پر تاوان لازم نہ ہوگا۔ (۲)

تشریح: قاضی کے فیصلہ کے بعد اگر گواہوں نے شہادت سے رجوع کر لیا تو اب چونکہ ان کے رجوع سے قاضی کا فیصلہ ٹوٹ نہیں سکتا، اس لئے اس جھوٹی شہادت کی وجہ سے مدعی علیہ کا جو کچھ نقصان ہوا اس کا تاوان گواہوں کے ذمہ ہوگا، کیونکہ اس نقصان کا وہ سبب بنے، لیکن یہ تاوان مطلقاً واجب نہ ہوگا، بلکہ اس وقت واجب ہوگا جبکہ بعینہ مال تلف ہوا ہو جیسے اس شہادت کی وجہ سے مدعی علیہ کو کوئی مال مدعی کو ادا کرنا پڑا ہو تو اس مال کا تاوان گواہوں پر آئے گا، اسی طرح قبل الدخول طلاق کی گواہی دی تو اگر مہر مسمی ہو تو ان گواہوں پر نصف مہر لازم ہوگا اور اگر مہر مسمی نہ ہو تو متعہ لازم ہوگا۔

(۱) (فإن رجعا قبل الحکم بها سقطت ولا ضمان) وعزر ولو عن بعضها لأنه فسق نفسه. جامع الفصولین (وبعده لم یفسخ) الحکم (مطلقاً) لترجحه بالقضاء. (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۸/ ۲۳۲، البحر الرائق: ۷/ ۲۱۶-۲۱۷)

(۲) وکون المتلف بها عیناً فلا ضمان لو رجع عن منفعة۔ (البحر الرائق: ۷/ ۲۱۵)

اور اگر بیع کی گواہی دی تو سامان کی قیمت میں بائع کا جس قدر نقصان ہوا اس کا تاوان ان پر لازم ہوگا، جبکہ بائع کے خلاف گواہی دی ہو اور اگر مشتری کے خلاف گواہی دی تو مشتری کو جس قدر زیادہ قیمت دینی پڑی ہو اس کا تاوان ان پر لازم ہوگا، اسی طرح اگر نکاح کی گواہی دی تو مہر مثل سے جس قدر مہر انہوں نے زیادہ بتایا ہو اس کا ضمان لازم ہوگا (مہر مثل یا اس سے کم مہر کی شہادت دی ہو تو اس میں ضمان نہیں ہے، کیونکہ یہ پورا مہر منفعت بضع کا عوض ہے اور جو اتلاف بالعوض ہو وہ درحقیقت اتلاف نہیں)[1]

اور اگر جھوٹی شہادت سے منافع کا نقصان ہوا جیسے نکاح کی گواہی دی اور شوہر نے دخول بھی کرلیا تو اس میں عورت کیلئے منفعت کا نقصان ہوا، یا اجرت مثل سے کم اجرت میں گھر کرایہ پر دینے کی گواہی دی تو مالک کیلئے گھر کی منفعت میں نقصان ہوا، تو اس میں گواہوں پر رجوع کے بعد کوئی تاوان لازم نہ ہوگا، کیونکہ منافع کے تلف پر کوئی تاوان نہیں آتا۔[2]

۴۵۶- **ضابطہ:** تاوان لازم کرنے کے سلسلہ میں اعتبار ان گواہوں کا ہوگا جو باقی ہیں (یعنی جنہوں نے رجوع نہیں کیا) نہ کہ ان گواہوں کا جنہوں نے رجوع کرلیا ہے۔[3]

---

(۱) ولا يضمن راجع في النكاح شهد بمهر مثلها أو أقل إذ الإتلاف بعوض كلا إتلاف، وإن زاد عليه ضمناها ... وضمنا في البيع والشراء مانقص عن قيمته المبيع لو الشهادة على البائع أو زاد لو الشهادة على المشترى للإتلاف بلاعوض ... وفى الطلاق قبل وطء وخلوة ضمنا نصف المال المسمى أو المتعة إن لم يسم۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۲۳۵)

(۲) فلا ضمان لو رجع عن منفعة: كالنكاح بعد الدخول، ومنفعة دار شهدا على المؤجر للمستأجر بإجارتها بأقل من أجر مثلها ثم رجعا۔ (البحر الرائق: ۷/ ۲۱۵)

(۳) العبرة فيه لمن بقى لا لمن رجع۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۲۳۳)

تفریع: پس اگر دو میں سے ایک گواہ نے رجوع کیا تو [اس کی شہادت سے جو کچھ مدعی علیہ کا نقصان ہوا اس نقصان میں] وہ نصف کا ضامن ہوگا، اور اگر تین میں سے ایک نے رجوع کیا تو اس پر ضمان نہ آئے گا، کیوں کہ باقی رہنے والے دو گواہ ہیں اور وہ شہادت کے لئے کافی ہے، لیکن اگر دوسرے نے بھی کچھ دیر بعد رجوع کرلیا تو اب پہلا اور یہ دوسرا دونوں نصف کے ضامن ہوں گے، دوسرے کا ضامن ہونا تو ظاہر ہے، پہلا کا ضامن ہونا اس لئے کہ اس کے رجوع کا اثر مانع کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوا تھا اور وہ مانع ہے باقی رہنے والوں کی تعداد کا نصاب شہادت کیلئے کفایت کرنا اور اعتبار انہی باقی رہنے والوں کا تھا، لیکن جب دوسرے نے بھی رجوع کرلیا تو اب مانع (نصاب شہادت کا باقی رہنا) زائل ہوگیا تو پہلے کے رجوع کا اثر بھی ظاہر ہوگا، اور تلف دونوں کی طرف منسوب ہوگا اور دونوں ضامن ہوں گے۔

اسی طرح اگر ایک مرد اور دو عورتوں میں سے ایک عورت نے رجوع کرلیا تو وہ ربع کی ضامن ہوگی، اور اگر دو عورتوں نے رجوع کیا تو وہ دونوں نصف کی ضامن ہوں گی۔ اور اگر ایک مرد اور دس عورتوں میں سے آٹھ عورتوں نے رجوع کیا تو ان پر ضمان نہ آئے گا، کیونکہ باقی رہنے والوں کی تعداد نصاب شہادت کے لئے کافی ہے، لیکن اگر ان باقی میں سے ایک اور عورت نے بھی رجوع کرلیا تو اب کل رجوع کرنے والی نو عورتوں پر ایک ربع کا ضمان آئے گا، ایک ربع اس لئے کہ نصاب کا تین ربع باقی ہے جنہوں نے رجوع نہیں کیا۔ اور اگر تمام رجوع کرلیں تو ان پر تاوان اسداس کے اعتبار سے آئے گا ایک سدس مرد پر اور پانچ سدس دس عورتوں پر کیونکہ ان میں ہر دو عورتیں ایک مرد کے قائم مقام ہے۔ (۱)

فإن رجع أحدهما ضمن النصف وإن رجع أحد ثلاثة لم يضمن وإن رجع آخر ضمنا النصف، وإن رجعت امرأة من رجل وامرأتين ضمنت الربع وإن رجعتا فالنصف، وإن رجع ثمان نسوة من رجل وعشر نسوة لم يضمن فإن رجعت ←

۴۵۷-**ضابطہ:** شہادت سے رجوع قاضی کی مجلس ہی میں معتبر ہے، عام مجلس میں معتبر نہیں۔ (۱)

تفریع: پس اگر مدعیٰ علیہ عدالت میں جاکر گواہوں کے رجوع کا دعویٰ کرے، کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنی شہادت سے رجوع کرلیا ہے، اور اس بات پر وہ ان سے یمین کا مطالبہ کرے تو اس کی شنوائی نہ ہوگی اور گواہوں سے قسم نہ لی جائے گی، اس لئے کہ مدعیٰ علیہ رجوع غیر معتبر کا دعویٰ کررہا ہے اور ایسا دعویٰ باطل ہے۔

اسی طرح مذکور دعویٰ پر مدعیٰ علیہ کوئی بینہ پیش کرے تو وہ بھی قبول نہ ہوگا۔ (۲)

← أخرى ضمن التسع ربعه لبقاء ثلاثة أرباع النصاب، فإن رجعوا فالغرم بالأسداس (الدرالمختار) وفي الشامية: (بالأسداس)السدس على الرجل وخمسة الأسداس على النسوة، لأن كل امرأتين تقوم مقام رجل واحد(شامی: ۲۳۴/۸)

(۱)ولايصح الرجوع الاعند القاضي۔(البحرالرائق:۲۱۶/۸)

(۲) وادعى المشهود عليه رجوعهما وأراد يمينهما لايحلفان، وكذا لاتقبل بينته عليهما، لأنه ادعى رجوعاباطلا۔(البحرالرائق:۲۱۷/۸)

باب الإخبار

(خبر دینے کا بیان)

۴۵۸-**ضابطہ**: امور غیر ملزمہ میں ایک باتمیز شخص کی خبر کافی ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور امور ملزمہ میں شہادت اپنی تمام شرائط (عدد، عدالت وغیرہ) کے ساتھ ضروری ہے۔ اور وہ امور جن میں من وجہ الزام ہو اور من وجہ الزام نہ ہو ان میں دو چیزوں میں سے ایک ضروری ہے یا تو عدد ہو (دو شخص ہوں) یا عدالت ہو (مخبر عادل ہو)[1]

تشریح: امور غیر ملزمہ: وہ امور ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی الزام نہ ہو جیسے بائع کا کہنا کہ میں فلاں کا وکیل ہوں یا مضارب ہوں[2] یا کسی کا کوئی چیز پیش کر کے یہ خبر دینا کہ فلاں نے آپ کو یہ چیز ہدیہ دی ہے یا عاریت یا ودیعت کے طور پر دی ہے

(۱) ثم اعلم أن المعاملات على ما في كتب الأصول ثلاثة أنواع. الأول: ما لا إلزام فيه كالوكالات والمضاربات والإذن بالتجارة، والثاني: ما فيه إلزام محض كالحقوق التي تجري فيها الخصومات. والثالث: ما فيه إلزام من وجه دون وجه كعزل الوكيل وحجر المأذون، فإن فيه إلزام العهدة على الوكيل وفساد العقد بعد الحجر وفيه عدم إلزام لأن المؤكل والمولى يتصرف في خالص حقه فصار كالإذن. ففي الأول يعتبر التمييز فقط. وفي الثاني شروط الشهادة وفي الثالث إما العدد وإما العدالة عنده خلافا لهما۔ (شامی: ۹/ ۴۹۸، البحر الرائق)

(۲) (خانیہ علی ہامش الہندیہ: ۳/ ۴۱۹)

وغیرہ: ان میں شہادت ضروری نہیں، صرف ایک باتمیز شخص کی خبر کافی ہے، خواہ وہ خبر دینے والا عادل ہو یا غیر عادل، مسلمان ہو یا کافر، بالغ ہو یا نابالغ سمجھ دار بچہ سب کی خبر قابل قبول ہوگی۔

اور امور ملزمہ سے مراد وہ امور ہیں جن میں بندے پر کسی چیز کو لازم کرنا یا اس کی ملکیت کو زائل کرنا ہو مثلاً اس کے ذمہ فلاں کا اتنا دین ہے، یا اس کا نسب بجائے اس کے فلاں شخص سے ثابت ہے یا اس نے یہ جرم کیا ہے جس کی وجہ سے اس پر یہ حد لازم ہے، یا اس نے فلاں کا مال چوری یا غصب کیا ہے، یا کوئی عورت کہے ان دو میاں بیوی کو میں نے دودھ پلایا ہے لہٰذا ان کا نکاح صحیح نہیں ہوا وغیرہ جن میں خصومات جاری ہوتی ہیں شہادت اپنی تمام شرائط کے ساتھ ضروری ہے محض خبر کافی نہ ہوگی۔

اور من وجہ الزام اور من وجہ عدم الزام کی مثال ہے وکیل کو معزول کرنا، یا جس کو تجارت کی اجازت دی گئی ہے اس پر روک لگانا۔ پس اس میں وکیل کو معزول کرنے اور ماذون کو تجارت سے منع کرنے کے اعتبار سے الزام کا معنی ہے، اور اس اعتبار سے کہ مالک خالص اپنے حق میں تصرف کر رہا ہے کوئی الزام نہیں ـــــ لہٰذا اس جیسی خبر میں عدد یا عدالت دونوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں، مخبر یا عادل شخص ہو یا عادل نہ ہو تو خبر دینے والے کم از کم دو افراد ہوں۔

فائدہ: علامہ ابن نجیمؒ نے اشباہ اور بحر میں شہادت اور خبر کے مابین شرائط واحکام کے اعتبار سے کچھ فروق بیان کئے ہیں، جن میں اہم اور بنیادی یہ ہیں:

(۱) شہادت میں عدد (دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا) شرط ہے، خبر میں یہ شرط نہیں۔[۱]

(۲) حدود و قصاص کی شہادت میں تمام گواہان کا مذکر ہونا شرط ہے، جبکہ خبر میں مطلقاً یہ شرط نہیں۔[۲]

(۳) اپنے اصول وفروع کے حق میں شہادت مقبول نہیں، جبکہ خبر مقبول ہے۔[۳]

(۴) شہادت علی الشہادت کی صحت کے لئے شرط ہے کہ اصل کی شہادت متعذر رہو، برخلاف خبر علی الخبر کے کہ اس میں یہ شرط نہیں۔ (۴)

(۵) محدود فی القذف کی شہادت توبہ کے بعد بھی مقبول نہیں، برخلاف اس کی خبر کہ وہ مقبول ہے۔ (۵)

علاوہ ازیں:

(۶) شہادت کا قاضی کی مجلس میں ہونا شرط ہے، خبر میں یہ شرط نہیں (پس فون کے ذریعہ بھی خبر دی جاسکتی ہے)

(۷) اور نصاب شہادت کی تکمیل کے بعد آگے گواہوں کی کثرت سے ثبوت میں قوت پیدا نہیں ہوتی، جبکہ خبر میں مخبروں کی کثرت سے تقویت آتی ہے، اگر ایک معتبر شخص حلال کی اور دو اشخاص حرام ہونے کی خبر دیں تو دو کی خبر کو ترجیح ہوگی۔ (۶)

۴۵۹- **ضابطہ:** دیانات کی خبر میں مخبر کا عادل ہونا ضروری ہے، جبکہ معاملات کی خبر میں صرف ایک باتمیز شخص کی خبر کافی ہے۔ (۷)

تشریح: جن امور میں خبر کافی ہوتی ہے اگر وہ دیانات کے قبیل سے ہیں جیسے یہ پانی ناپاک ہے یا یہ ذبیحہ حرام ہے وغیرہ: ان میں مخبر کا مسلمان اور عادل ہونا ضروری

(۵،۴،۳،۲،۱) يشترط العدد فيها دون الرواية، لاتشترط الذكورة في الراوية مطلقاً وتشترط في الشهادة بالحدود والقصاص ...لاتقبل الشهادة لأصله وفرعه ورقيقه بخلاف الرواية...لاتقبل الشهادة على الشهادة إلا عند تعذر الأصل بخلاف الرواية ...لاتقبل شهادة المحدود في قذف بعد التوبة وتقبل روايته (الأشباه والنظائر: ۳۲۶، بيروت لبنان)

(۶) وكذا لو أخبره عدلان الصدق يترجح بزيادة العدد في المخبر بخلاف الشهادة (البحر الرائق: ۸/ ۲۱۳ كتاب الكراهية في الأكل والشرب متكئاً، شاملة)

(۷) (الدر والشامي: ۹/ ۴۹۸-۴۹۹)

ہے، پس فاسق یا کافر کی خبران میں معتبر نہ ہوگی ——— اور اگر مخبر مستور الحال ہو یعنی اس کا عادل یا غیر عادل ہونا معلوم نہ ہو تو تحری کر کے غالب گمان پر عمل کیا جائے گا، اگر غالب گمان عادل ہونے کا ہے تو اس کی خبر معتبر ہوگی ورنہ معتبر نہ ہوگی۔

جبکہ معاملات کی خبر میں جیسے مضاربت، وکالت یا ارسال ہدیہ وغیرہ کی خبر میں مخبر کا عادل ہونا ضروری نہیں، بلکہ کافر، اور نابالغ کی خبر بھی۔ بشرطیکہ وہ باشعور ہو۔ معتبر ہے۔ (۱)

۴۶۰-ضابطہ: خبر کے اعتبار میں اصل اور فرع کے مابین فرق کیا جائے گا۔ (۲)

تشریح: یعنی اصل کے متعلق خبر کا اعتبار نہ ہوگا، جبکہ فرع کے متعلق خبر معتبر ہوگی۔

جیسے کسی مرد یا عورت نے زوجین کے درمیان رشتۂ رضاعت کی خبر دی مثلاً کہا: یہ دونوں میاں بیوی رضاعی بھائی بہن ہیں تو اس سے میاں بیوی میں تفریق نہ کی جائے

---

(۱)(وأصله أن المعاملات يقبل فيها خبر كل مميز حرا كان أو عبدا مسلما أو كافرا صغيرا أو كبير العموم الضرورة الداعية إلى سقوط اشتراط العدالة(تبيين الحقائق: الجزء۱۶/۳۳۱، كتاب الكراهية، المكتبة الشاملة)(وشرط العدال في الديانات)هي التي بين العبد والرب (كالخبر عن نجاسة الماء فيتيمم)ولا يتوضاءالخ(الدر المختار على هامش رد المحتار: ۹/۴۹۸- ۴۹۹، كتاب الحضر والإباحة، مكتبه زكريا ديوبند- الاختيار لتعليل المختار: ۱/۴۹، المكتبة الشاملة)ولا يقبل في الديانات قول المستور في ظاهر الرواية، وعن ابى حنيفة أنه يقبل قوله فيها بناء على ما شاهد من أهل عصره؛ لأن الصلاح كان غالبا فيه ولهذا جاز القضاء بشهادته والظاهر أنه كالفاسق حتى يعتبر في خبره في الديانات أكبر الرأي كما في خبر الفاسق لظهور الفساد في زماننا . (تبيين الحقائق: الجزء ۱۶/ ۳۳۲، كتاب الكراهية، المكتبة الشاملة)

(۲) يفرق في الاخبار بين الاصل والفرع۔ (قواعد الفقه: ۱۴۳، قاعده: ۴۱۹)

گی کیونکہ اس خبر کا منشاء نکاح کے عدم جواز کو بتلانا ہے یعنی ان دونوں کا نکاح سرے سے صحیح نہیں ہوا، اور نکاح اصل ہے لہٰذا یہ خبر معتبر نہ ہوگی، اس میں شہادت کاملہ یعنی دومرد یا ایک مرد اور دوعورتوں کی باقاعدہ شہادت ضروری ہے۔

برخلاف اگر کسی نے طلاق یا خلع کی خبر دی یعنی عورت کو کہا کہ تمہارے شوہر نے تم کو طلاق دیدی ہے یا تم سے خلع کرلیا ہے، تو یہ خبر معتبر ہوگی اور اس کی وجہ سے دونوں میں تفریق کردی جائے گی، کیونکہ طلاق اور خلع نکاح کی فرع ہیں اور فرع کے متعلق شخص واحد کی خبر معتبر ہے۔ (۱)

فائدہ: خانیہ میں ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر غایب ہو اور کوئی عادل شخص آکر خبر دے کہ اس کا شوہر مرگیا ہے اور خود میں نے اس کی لاش دیکھی ہے یا اس کے جنازہ میں حاضر تھا یا خبر دے کہ اس کے شوہر نے اسے تین طلاق دی ہے تو اس شخص کی بات معتبر ہوگی، پس عورت عدت گذارے گی اور دوسری شادی کرسکتی ہے —— برخلاف اگر فاسق نے آکر یہ خبر دی، یا عادل نے خبر دی لیکن شوہر موجود ہے، غائب نہیں ہے تو پھر اس خبر کا اعتبار نہ ہوگا۔ ہاں اگر فاسق نے طلاق نامہ پیش کیا اور کہا یہ تمہارے کے شوہر کی طرف سے ہے تو اس میں عورت غالب رائے پر عمل کرے گی، اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس کے شوہر کی طرف سے ہے تو طلاق تصور کرے ورنہ نہیں۔ (۲)

---

(۱) قال (أي صاحب العقائد النسفية: ابو حفص عمر) من مسائله: ان المرأة اذا أخبرت بالرضاع بين الزوجين لم يفرق بينهما ويفرق في الفرع بطلاق أو خلع (حاشيه اصول الكرخي مع قواعد الفقه: ۱۵- ہدایہ: ۲/ ۳۵۲- و: ۴/ ۴۶۴ ملخصاً)

(۲) وكذا لو أن امرأة غاب عنها زوجها فأخبرها مسلم ثقة أن زوجها طلقها ثلاثاً أو مات عنها أو كان غير ثقة فاتاها بكتاب من زوجها بالطلاق وهي لاتدري أن الكتاب كتاب زوجها أم لا إلا أن أكبر رأيها أنه حق لابأس بأن تعتد وتزوج۔ (خانية على هامش الهنديه: ۳/ ۴۲۱)

کتاب الاقرار

۴۶۱-**ضابطہ**: اقرار اخبار ہے، انشاء نہیں۔[۱]

تشریح: اقرار کا لغوی معنی ہے اثبات یعنی کسی چیز کو ثابت کرنا، اصطلاح میں اقرار کہتے ہیں: دوسرے کا حق اپنے ذمہ ہونے کی خبر دینا، پس اس طرح اقرار سے کوئی حق ثابت نہیں ہوتا بلکہ پہلے سے ثابت شدہ کسی "حق" کی خبر واطلاع اس کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ اس پر یہ احکام متفرع ہوں گے۔

تفریعات:

(۱) اگر کسی نے جھوٹا اقرار کیا مثلاً کہا میرے ذمہ فلاں کے اتنے روپے ہیں تو مقرلہ (جس کے لئے اقرار کیا گیا ہے) کے لئے وہ روپے لینا حلال نہ ہوگا، کیونکہ محض اقرار سے آدمی کسی چیز کا مستحق نہیں ہوتا جب تک کہ پہلے سے اس شی ءپر اس کا حق ثابت نہ ہو (ہاں اگر اقرار کے بعد وہ شخص بہ طیب خاطر وہ روپے دیدے تو پھر مقرلہ کے لئے لینا جائز ہوگا، کہ گویا یہ از سر نو "ہبہ" ہے)[۲]

(۲) اگر شوہر سے جبراً طلاق دلوائی جائے تو حکم یہ ہے طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن اگر جبر واکراہ سے طلاق کا اقرار کرایا گیا یعنی اس سے کہلوایا گیا تو اس بات کا اقرار کرکہ

(۱) الاقرار اخبار لا انشاء فلا یطیب للمقرله لو کان کاذباً۔ (قواعد الفقہ: ۶۰، قاعدہ: ۴۰)

(۲) ولهذا قلنا من أقر لغیره بمال والمقر له یعلم أنه کاذب في إقراره فإنه لا یحل بینه وبین الله تعالیٰ إلا أن یسلم بطیب نفسه فیکون تملیکاً مبتدأ منه علی سبیل الهبة۔ (تاتارخانیہ: ۴؍۵، مسئلہ: ۱۱۱؍۲۰۱، مکتبہ زکریا دیوبند)

میں طلاق دے چکا ہوں یا طلاق دیے جانے کا اقرار کرتا ہوں تو طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ اقرار کسی چیز کو وجود میں نہیں لاتا بلکہ پہلے سے ثابت شدہ چیز کو ظاہر کرتا ہے، اور شوہر نے پہلے طلاق دی نہیں ہے اس لئے یہ اقرار باطل ہے۔ (۱)

(۳) اسی طرح اگر کسی نے اپنے مکان کے نصف حصہ کا کسی کے لئے اقرار کیا تو یہ اقرار معتبر ہے اور نصف حصہ اس کو سپرد کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ اقرار کے ذریعہ اس نے گھر کے نصف حصہ میں پہلے سے اس کی شراکت موجود ہونے کی خبر دی ہے، اور اقرار اخبار ہے، اگر انشاء ہوتا تو یہاں نصف مکان کا قبل تقسیم ہبہ کرنا لازم آتا، اور مشاع چیز کا ہبہ قبل تقسیم صحیح نہیں ہے۔ (۲)

۴۶۲- **ضابطہ**: اقرار خاص مقر کے حق میں ثابت ہوگا غیر پر مؤثر نہ ہوگا (کیونکہ اقرار حجت قاصرہ ہے، برخلاف شہادت کے کہ جو امر شہادت سے ثابت ہوتا ہے وہ تمام لوگوں پر حجت ہوتا ہے) (۳)

تفریعات:

(۱) پس اگر کسی نے زنا کا اقرار کیا تو خاص مقر پر حد جاری کی جائے گی، جس عورت کے ساتھ مقر نے زنا کرنا بتلایا اس عورت پر (بلا ثبوت کے) حد جاری نہ کی جائے گی،

(۱) ولا يصح إقراره بطلاق وعتاق مكرها الخ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۳۵۱)

(۲) الإقرار بالمشاع صحيح سواء كان المشاع قابلا للقسمة أو غير قابلة لأن الإقرار إخبار وليس بإنشاء فإن التمليك بلا بدل هبة فلو كان الإقرار إنشاء لما جاز الإقرار بمشاع قابل القسمة. (درر الحكام في شرح مجلة الأحكام: ۱۱/ ۴۶، المادة: ۱۵۸۵)

(۳) اقرار المقر إنما يثبت في حقه خاصة (قواعد الفقه: ۶۱، قاعده: ۴۳) الإقرار حجة قاصرة (قواعد الفقه: ۶۶، قاعده: ۶۴)

کیونکہ مقر کا اقرار خاص اسی کے حق میں ثابت ہوتا ہے غیر پر موثر نہیں ہوتا۔ (۱)

(۲) کسی وارث نے اپنے مورث کے ذمہ دین کا اقرار کیا اور دوسرے ورثاء نے انکار کیا تو خاص اقرار کرنے والے کے حصۂ میراث سے دین ادا کیا جائیگا، دوسرے ورثاء کے ذمہ یہ دین نہ آئے گا، کیونکہ اقرار غیر کے حق پر اثر نہیں کرتا۔ (۲)

(۳) کسی عورت نے قسم کھا کر کہا کہ میرے خسر نے میرے ساتھ فلاں وقت میں زنا کیا ہے لیکن میں نے شرم کی وجہ سے اب تک افشاء نہیں کیا اور اس کا خسر بحلف کہتا ہے کہ میں نے ایسے فعل کا کبھی ارتکاب نہیں کیا، تو محض عورت کے اقرار سے حرمت مصاہرت ثابت نہ ہوگی جب تک کہ شوہر اس کی تصدیق نہ کرے کیونکہ یہ اقرار شوہر سے متعلق ہے کہ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی لہذا یہ اقرار موثر نہ ہوگا برخلاف شہادت معتبرہ کے۔ (۳)

(۴) اسی طرح اگر کسی نے غیر معروف النسب شخص کیلئے بھائی ہونے کا اقرار کیا تو وہ غیر معروف شخص مقر کی میراث میں تو شریک ہوگا، لیکن بھائی ہونا یعنی نسب اس وقت تک ثابت نہ ہوگا جب تک کہ مقر کا باپ اس کی تصدیق نہ کرلے، کیونکہ میراث کا تعلق تو خود مقر کی ذات سے ہے، لیکن نسب کا تعلق اس کے باپ سے ہے اس لئے کہ مقر کا یہ کہنا کہ یہ میرا بھائی ہے اس کا مطلب ہے میرے باپ کا لڑکا ہے اور اقرار صرف مقر کے حق میں مؤثر ہوتا ہے غیر کے حق میں مؤثر نہیں ہوتا۔ (۴)

---

(۱) (درر الحکام شرح غرر الأحکام: ۸/۱۳۳)

(۲) أحد الورثة أقر بالدين المدعی به علی مورثه وجحده الباقون یلزمه الدین کله یعنی ان وفی مارثه به۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۸/۲۶۹)

(۳) (فتاویٰ دار العلوم: ۱۵/۱۵۲)

(۴) حتی لو أقر مجهول النسب بالرق لرجل جاز ذلک علی نفسه وماله ولم یصدق علی أولاده وأمهاتهم ومدبریه ومکاتبیه إذ ثبت حق الحریة واستحقاقها

۴۶۳-**ضابطہ**: جوشخص انشاء کا مالک ہوتا ہے وہ اخبار (یعنی اقرار) کا مالک ہوتا ہے۔(۱)

تفریعات:

(۱) شوہر نے طلاق رجعی کی عدت میں کہا کہ میں نے چند دن پہلے بیوی سے رجوع کرلیا تھا تو اس کی بات معتبر ہوگی اور رجوع تسلیم کرلیا جائے گا، کیونکہ عدت موجود ہونے سے فی الحال وہ انشاء رجوع کا مالک ہے تو اقرار کا بھی مالک ہوگا۔ لیکن اگر عدت ختم ہونے کے بعد یہ قرار کیا کہ میں نے عدت کے زمانہ میں فلاں دن رجوع کیا تھا تو یہ اقرار معتبر نہ ہوگا کیونکہ جس وقت وہ اقرار کررہا ہے اس وقت عدت موجود نہ ہونے سے وہ انشاء رجوع کا مالک نہیں ہے (یعنی فی الحال رجوع کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا ہے) تو اب اس کے اقرار کا بھی مالک نہ ہوگا، لہذا رجوع ثابت نہ ہوگا، مگر یہ کہ شوہر اپنے دعویٰ پر بینہ پیش کردے۔(۲)

(۲) اسی طرح اگر شوہر طلاق کا اقرار کرتا ہے مثلاً میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے یا نکاح سے الگ کردیا ہے وغیرہ تو اس کا یہ اقرار معتبر ہوگا اور طلاق واقع ہوجائے گی اگرچہ اس نے ماضی میں طلاق نہ دی ہو اور جھوٹا اقرار کیا ہو کیونکہ وہ فی الحال انشاء کا مالک ہے تو اقرار کا بھی مالک ہوگا پس اس کا اقرار خواہ صحیح ہو یا غلط معتبر ہوگا، اور چونکہ انشاء فی الماضی انشاء فی الحال ہوتا ہے اس لئے اقرار کے وقت سے طلاق واقع ہوگی۔ (البتہ مکرہ سے طلاق کا اقرار کروایا گیا تو طلاق واقع نہ ہوگی جیسا کہ گذرا کیونکہ اقرار

لهؤلاء فلا يصدق عليهم۔ (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۸/۱۳۳)

(۱) من ملک الانشاء ملک الاخبار۔ (قواعد الفقہ: ۱۳۰، قاعدہ: ۳۵۷)

(۲) ولو أقام بينة بعد العدة أنه قال في عدتها قد راجعتها .... كذا في المبسوط قيد بقوله بعد العدة لأنه لو قال في العدة كنت راجعتك أمس ثبتت، وإن كذبته لملكه الإنشاء في الحال. (البحر الرائق: ۴/۵۶، شاملة)

میں رضامندی شرط ہے پس وہ اس ضابطہ کے تحت داخل ہوگا کہ "اقرار اخبار ہے انشاء نہیں"۔[1]

۴۶۴-**ضابطہ:** مکرہ کا اقرار باطل ہے۔[2]

تشریح: یعنی جس سے زبردستی اقرار کروایا جائے اس کا اقرار باطل ہے، کیونکہ اقرار میں رضامندی لازم ہے۔

تفریع: پس اگر کسی پر زبردستی کر کے اپنے ذمہ کوئی حق کے ہونے کا اقرار کروایا گیا یا اقرارنامہ پر دستخط کروایا گیا یا جبر و اکراہ سے طلاق کا اقرار کروایا گیا تو اس کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، مقر پر نہ کوئی حق ثابت ہوگا اور نہ اس کی طلاق واقع ہوگی۔

لیکن مکرہ کا انشائی کلام صحیح ہوتا ہے، چنانچہ اگر اس سے کہلوایا گیا کہ ایسا کہہ: "میری بیوی کو طلاق ہے" یا "میں طلاق دیتا ہوں" تو طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ یہ انشاء ہے، اقرار نہیں ہے۔[3]

۴۶۵-**ضابطہ:** مرض وفات میں مریض کا اجنبی کے لئے دین کا اقرار صحیح ہے اور وارث کے لئے اقرار باطل ہے۔[4]

---

(۱) ولو قيل له: طلقت امرأتك فقال: نعم أو بلى بالهجاء طلقت بحر... (أنت طالق واحدة أو لا أو مع موتي أو مع موتك لغو) أما الأول فلحرف الشك، وأما الثاني فلإضافته لحالة منافية للإيقاع أو الوقوع (كذا أنت طالق قبل أن أتزوجك أو أمس و) قد (نكحها اليوم) ولو نكحها قبل أمس وقع الآن لأن الإنشاء في الماضي إنشاء في الحال. (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۲۶۶/۳، ۲۴۹ شاملہ)

(۲) اقرار المكره باطل۔ (قواعد الفقہ: ۶۱، قاعدہ: ۴۴)

(۳) وكذا لا يصح الإقرار بالطلاق والعتاق مع الإكراه، والإنشاء يصح مع الإكراه الخ (تاتارخانیہ: ۱۴/۵، مسئلہ: ۲۰۱۱۱، مکتبہ زکریا دیوبند)

(۴) قال في الأصل: إذا أقر الرجل في مرضه بدين لغير وارث فإنه يجوز، وإن أحاط ذلك بماله، وإن أقر لوارث فهو باطل الخ (شامی: ۳۸۰/۸، مکتبہ زکریا دیوبند)

تشریح: مرض وفات میں اجنبی کے لئے اقرار خواہ تمام مال کا کیا ہو صحیح ہے، کیونکہ اقرار کے ذریعہ اس نے کوئی حق ثابت نہیں کیا ہے بلکہ پہلے سے ثابت شدہ حق کی خبر دی ہے [لیکن اگر متعدد قرض خواہ ہوں تو پہلے صحت کے زمانہ کے دین کو اور اس دین کو ادا کیا جائے گا جس کی وجہ معلوم ہو پھر جائداد باقی رہے تو ان لوگوں کا دین ادا کیا جائے گا جن کے لئے مرض وفات میں اقرار کیا ہے، کیونکہ صحت کے زمانہ کا دین مرض وفات کے دین سے قوی ہے، مرض وفات میں تو یہ احتمال ہے کہ اس نے اپنے صحیح حقداروں کو محروم کرنے کے لئے غلط اقرار کرلیا ہوگا، اس لئے اس کو مؤخر کیا جائے گا][1]

اور وارث کے لئے اقرار بالکلیہ باطل ہے، کیونکہ اس نے اگر وراثت سے کوئی چیز لی ہوتی تو دوسرے ورثاء سے یہ مخفی نہ ہوتا یہاں اتہام اجنبی کے لئے اقرار کی بنسبت زیادہ ہے پس یہ اقرار باطل ہوگا [لیکن اگر دوسرے ورثاء اس کی تصدیق کرلیں تو پھر یہ اقرار صحیح ہوگا، اور اقرار کے موافق اس وارث کو پہلے وہ سامان دیا جائے گا، پھر وراثت تقسیم کی جائے گی]

۳۶۶-**ضابطہ**: مرض موت میں صحت کے زمانہ کی طرف منسوب کرکے کچھ اقرار کرنا مرض ہی میں اقرار کے حکم میں ہے۔

تفریعات:

(۱) پس اگر مرض موت کے مریض نے کہا کہ میں نے اپنے فلاں وارث سے صحت کے زمانہ میں اتنا قرض لیا تھا تو یہ اقرار صحیح نہیں جیسا کہ زمانہ مرض میں قرض لینے کا اقرار صحیح نہیں۔ مگر یہ کہ دوسرے ورثاء اس کی تصدیق کرلیں تو بنا بر تصدیق یہ اقرار

---

(۱) ودين الصحة مطلقا وما لزمه في مرضه بسبب معروف ببينة و بمعاينة قاض قدم على ما أقر به في مرض موته... والسبب المعروف۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/۳۸۰، مكتبہ زكريا ديوبند)

معتبر ہوگا۔

(۲) اسی طرح اگر اقرار کیا کہ میں نے فلاں زمین یا مکان اپنے اس وراث کو صحت کے زمانہ میں ہدیہ کردیا تھا تو یہ اقرار نافذ نہ ہوگا۔ مگر یہ کہ بینہ سے یہ بات ثابت ہوجائے، یا دیگر وارثین اس کی تصدیق کرلیں۔ (۱)

۴۶۷-**ضابطہ**: ہر ایسا تصرف جس کی صحت وتحقق کے لئے جہالت مانع نہیں اس میں مجہول اقرار صحیح ہے، اور جو تصرف ایسا نہ ہو اس میں مجہول اقرار صحیح نہیں۔

جیسے غصب، ودیعت اور ان کے مثل کوئی چیز کہ ان کی صحت وتحقق کے لئے جہالت مانع نہیں یہی وجہ ہے کہ اگر مثلاً بیگ غصب کرلیا اور اس میں سامان کیا ہے وہ معلوم نہیں یا اس کو کسی کے پاس امانت رکھوایا اور اس میں موجود مال کی وضاحت نہیں کی تو باوجود جہالت کے یہ غصب اور ودیعت صحیح ہیں اور ان کا حکم ثابت ہوجاتا ہے، تو ان کا اقرار بھی جہالت کے ساتھ صحیح ہوگا چنانچہ اگر اقرار کیا کہ میں نے ایک بیگ غصب کیا تھا یا کہا آپ نے میرے پاس ایک بیگ ودیعت رکھا تھا تو یہ اقرار صحیح ہوگا، گو اس نے وضاحت نہ کی ہو کہ اس بیگ میں مال کیا اور کتنا ہے؟

اور اگر ایسے تصرف کا اقرار کیا جو جہالت کے ساتھ صحیح نہیں ہوتا ہے جیسے بیع، شراء، اجارہ وغیرہ، مثلاً اقرار کیا کہ فلاں کو میں نے کچھ بیچا ہے، یا اس سے کچھ خریدا ہے، یا اس کو اجرت پر دیا ہے اور وضاحت نہیں کی کہ وہ چیز کیا ہے تو یہ اقرار صحیح نہیں، اور مقر کو کسی

(۱) (المادة: ۱۶۰۰) إقرار المريض فى مرض موته بالإسناد إلى زمن الصحة فى حكم الإقرار فى زمن المرض، فلو أقر أحد فى مرض موته بأنه قد استوفى دينه الذى على وارثه فى زمان صحته لا ينفذ إقراره ما لم يجز باقى الورثة، كذلك لو أقر أحد فى مرض موته بأنه قد وهب ماله الفلانى حال صحته لأحد ورثته فلان، وأنه سلمه إياه لا ينفذ إقراره ما لم يثبت ببينة، أو يجزه باقى الورثة۔ (درر الحكام فى شرح مجلة الأحكام: ۱۱۳/۱۱، المادة: ۱۶۰۰)

چیز کے دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔[1]

۴۶۸- **ضابطہ:** حقوق العباد میں اقرار کے بعد رجوع صحیح نہیں، حقوق اللہ میں صحیح ہے۔

تشریح: حقوق العباد جیسے قصاص، دیت، طلاق، عتاق، حق شفعہ یا دوسرے کے لئے مال ثابت کرنا وغیرہ: ان میں اقرار کے بعد رجوع صحیح نہیں، کیونکہ مقرلہ کے لئے وہ چیز مقر کے اقرار سے پہلے ہی ثابت ہوچکی ہے، مقر نے تو اقرار کے ذریعہ صرف اس کی خبر دی ہے، پس اب اس سے رجوع کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اور حقوق اللہ جیسے زنا، سرقہ، شرب خمر وغیرہ: ان کے اقرار کے بعد رجوع صحیح ہے، یعنی رجوع کے بعد مقر پر اس جرم کی کوئی حد جاری نہ کی جائے گی، کیونکہ شبہات سے حدود ساقط ہوجاتی ہیں، اس نے جب اقرار کے بعد اس سے رجوع کرلیا تو اس سے ایک گونہ شبہ پیدا ہوگیا جو حد جاری کرنے کے لئے مانع ہوگا۔[2]

---

(۱) كل تصرف لايشترط لصحته وتحققه إعلام ماصادفه ذالك التصرف فالاقراربه مع الجهالة صحيح، وذالك كالغصب والوديعة وأشباهمافإن الجهالة لاتمنع صحة الغصب والوديعة وتحققهما فإن من غصب من رجل مالامجهولافي كيس أو أودعه مالامجهولافي كيس فإنه تصح الوديعة والغصب ويثبت حكمهما۔ وكل تصرف ليشترط لصحته وتحققه اعلام ماصادفه ذالك التصرف فالاقرار مع الجهالة لايصح وذالك كالبيع والشراء والإجارة فإن من أقر أنه باع من فلان شيئاً أو آجر من فلان شيئاً أو اشترى من فلان كذا وكذالايصح إقراره ولايجبر المقر على تسليم شيء ۔(تاتارخانیہ: ۱۴/۵۷، مکتبہ زکریا دیوبند)

(۲) إذاأقر البالغ العاقل بشيء ثم رجع لايصح رجوعه فيما هو من حقوق العباد ... وماوجب حقاًالله تعالى مجرداًعن حقوق العباد كالزناوالسرقة ←

فائدہ: اقرار کے بعد مکر جانا یعنی انکار کردینا کہ میں نے اقرار کیا ہی نہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ مقر سے قسم لی جائے گی کہ میں نے ایسا اقرار بالکل نہیں کیا جس کا وہ دعویٰ کررہا ہے، اگر قسم کھالی تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا انکار کرنا صحیح نہ ہوگا، یہ حکم عین یعنی مال کے اقرار کا ہے ــــ عین کے علاوہ میں جیسے طلاق کے اقرار کے بعد انکار کیا تو اس میں شوہر سے قسم نہ لی جائے گی، فتویٰ اسی پر ہے۔[1] بلکہ اس میں شوہر کا قول معتبر ہوگا جب تک کہ بینہ سے اس کا اقرار بالطلاق ثابت نہ ہوجائے، لیکن اگر عورت نے خود سن لیا ہو تو اس کو اپنے آپ پر شوہر کو قدرت دینا حلال نہ ہوگا، جیسا کہ کتاب الطلاق میں یہ مسئلہ گذر چکا ہے۔

۴۶۹- **ضابطہ**: ہر وہ چیز جس میں حق کسی ایک کے لئے ہوتا ہے مقرلہ کے رد کرنے سے اس میں اقرار باطل ہوجاتا ہے اور جہاں دونوں جانب حق ہوتا ہے مقرلہ کے رد کرنے سے اقرار باطل نہیں ہوتا۔

تشریح: ایک جانب حق ہونا جیسے ہبہ اور صدقہ کہ اگر اس کا کسی نے اقرار کیا یعنی کہا میں نے یہ چیز تمہیں ہدیہ کردی ہے یا صدقہ کی ہے اور مقرلہ نے اس کو رد کردیا اور کہا آپ نے ہدیہ وصدقہ کچھ نہیں کیا تو یہ اقرار باطل ہوگیا، اب مقرلہ پھر اس کی تصدیق کرے تو اس کی بات قبول نہ ہوگی اور ہدیہ یا صدقہ اس کے لئے ثابت نہ ہوگا کیونکہ اس میں حق صرف ایک کے لئے ہے (مگر یہ کہ مقر پھر سے اقرار کرے اور وہ اس کی

← وشرب الخمر يصح رجوعه قبل الاستيفاء۔ (تاتارخانیہ: ۱۴/۴-۵، مکتبہ زکریا دیوبند)

(۱) رجل اقر بعين لرجل ثم أنكر اختلف المشائخ فيه قال ابو نصر الدبوسي يحلف باالله ما اقررت له بكذا (تاتارخانیہ: ۱۴/۱۷۱، مسئلہ: ۲۰۱۶۰، مکتبہ زکریا دیوبند)

ثم لو أنكر الاقرار هل يحلف؟ الفتوى انه لا يحلف على الإقرار بل على المال۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/۳۵۱، مکتبہ زکریا دیوبند)

تصدیق کرے تو یہ از سر نو اقرار ہوگا اور درست ہوگا)

اور دو جانب حق ہونا جیسے بیع، نکاح وغیرہ، جیسے اگر کسی نے کہا میں نے یہ شیٔ تم کو ایک ہزار میں بیچ دی ہے دوسرے نے کہا میں نے اس کو خریدا ہی نہیں ہے، پھر بائع خاموش رہا یہاں تک کہ مشتری نے مجلس میں یا مجلس کے بعد کہا جی ہاں مجھے یاد آیا میں نے اس کو خریدا ہے تو یہ جائز ہے اور رد کے بعد تصدیق درست ہے، اسی طرح نکاح وغیرہ ہر ایسی چیز جس میں جانبین سے حق ہوتا ہے مقرلہ کے رد کرنے سے اقرار باطل نہیں ہوتا رد کے بعد بھی اس کی تصدیق معتبر ہے۔[1]

کتاب القضاء

۴۷۰- **ضابطہ:** ہر وہ شخص جو شہادت کا اہل ہے وہ قضاء کا اہل ہے اور جو شہادت کا اہل نہیں ہے وہ قضاء کا اہل نہیں ہے۔[2]

تفریع: پس مجنون، نابالغ بچہ، کافر، غلام، اندھا، گونگا، اور محدود فی القذف کو قاضی بنانا درست نہیں کیونکہ قضاء کا تعلق باب ولایت سے ہے بلکہ اعظم ولایت سے ہے اور یہ سب لوگ ادنی ولایت- اور وہ شہادت ہے- کے اہل نہیں ہیں تو اعلی ولایت (قضاء) کے بدرجہ اولی اہل نہ ہوں گے۔

اور عورت کا حدود و قصاص کے مقدمات میں قاضی بننا درست نہیں، بقیہ مقدمات

---

(۱) و بخط السائحانی عن الخلاصة لو قال لآخر : کنت بعت العبد بألف فقال الآخر : لم اشتره منک فسکت البائع ، حتی قال المشتری فی المجلس أو بعده بل اشتریته منک بألف فهو الجائز و کذا النکاح و کل شیء یکون لهما جمیعا فیه حق ، و کل شیء یکون فیه الحق لو احد مثل الهبة و الصدقة لا ینفعه إقراره بعد ذلک (شامی: ۸/ ۳۵۲، مکتبہ زکریا دیوبند)

(۲) فکلّ من کان أهلا للشهادة یکون أهلا للقضاء الخ (ہدایہ: ۳/ ۱۰۱، مکتبہ شاملہ)

میں وہ قاضی ہوسکتی ہے، کیونکہ حدود وقصاص میں وہ شہادت کی اہل نہیں ہے اس کی شہادت ان میں غیر معتبر ہے تو ان مقدمات میں اس کا قاضی بننا بھی درست نہیں، اور حدود وقصاص کے علاوہ مقدمات میں وہ شہادت کی اہل ہے تو ان میں اس کا قاضی بننا بھی درست ہے یہ حکم امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے، جبکہ اکثر فقہاء کے یہاں عورت کا ہر طرح کے مقدمات میں قاضی بننا درست نہیں ہے۔ اور امام صاحب کے نزدیک بھی گو بعض مقدمات میں عورت قاضی بن سکتی ہے لیکن بلاضرورت اس کو عہدۂ قضاء سپرد کرنا گناہ سے خالی نہیں۔

اور فاسق شخص کا قاضی بننا درست ہے کیونکہ فاسق نفس شہادت کا اہل ہے (جیسا کہ کتاب الشہادت میں گزر چکا) تو قضاء کا بھی اہل ہوگا۔ اور فاسق خواہ اس کا فسق عملاً ہو یا اعتقاداً حکم میں برابر ہے پس بدعتی، مودودی، غیر مقلد وغیرہ کا بھی قاضی بننا درست ہوگا، بشرطیکہ ان کا عقیدہ موجب کفر نہ ہو۔ البتہ امیر وسلطان کی ذمہ داری ہے کہ فاسق کو عہدۂ قضا سپرد نہ کرے ورنہ وہ ماخوذ ہوگا۔ (۱)

(۱) فلا يجوز تقليد المجنون والصبي والكافر والعبد والأعمى والأخرس والمحدود في القذف لأن القضاء من باب الولاية بل هو أعظم الولايات وهؤلاء ليست لهم أهلية أدنى الولايات -وهي الشهادة- فلأن لا يكون لهم أهلية أعلاها أولى- وأما الذكورة فليست من شرط جواز التقليد في الجملة لأن المرأة من أهل الشهادات في الجملة الا أنها لا تقضي بالحدود والقصاص لأنه لا شهاد لها في ذلك، وأهلية القضاء تدور مع أهلية الشهادة۔ (بدائع الصنائع: ۳/۷ مکتبہ شاملہ) ما اتفقت كلمتهم عليه في كتبهم المعتمد من أنّ اهل الشهادة فمن صلح لها صلح له ومن لا فلا (شامی: ۲۸/۸) وتقبل من أهل الهواء أى اصحاب بدع لا نكفر كجبر الخ (الدر المختار) وفي الشامية: انما تقبل شهادتهم لأن فسقهم من حيث الاعتقاد وما أوقعهم فيه الا التعمق والغلو في الدين والفاسق انما ترد ←

۱۷۴- **ضابطہ**: عہدۂ قضاء تقیید اور تعلیق کو قبول کرتا ہے۔ [1]

تشریح: پس اگر امیر وسلطان نے کہا جب تو فلاں شہر میں پہنچے تو تو وہاں کا قاضی ہے؛ یا فلاں شخص کا انتقال ہو جائے اس کے بعد قاضی ہے؛ یا اتنے وقت کے بعد قاضی ہے؛ یا مخصوص وقت تک قاضی ہے پھر معزول ہے؛ یا تو تمام مقدمات کا قاضی ہے مگر فلاں قضیہ: کہ وہ قضیہ تو حل نہیں کرے گا؛ تو یہ تمام قیود وشرائط عہدۂ قضا میں صحیح ہیں اور قاضی کو ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے کیونکہ امارت وعہدہ تقیید اور تعلیق کو قبول کرتا ہے؛ دلیل اس پر غزوۂ موتہ میں لشکر بھیجتے وقت رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: کہ اگر زید بن حارثہ شہید ہو جائیں تو جعفر تمہارے امیر ہیں اور جعفر شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ امیر ہوں گے، پس اس سے معلوم ہوا کہ امارت کو کسی امر یا وقت پر معلق کرنا جائز ہے۔ [2]

← شهادته بتهمة الكذب ....فمن وجب اكفاره منهم فالأكثر على عدم قبوله۔ (شامی:۸/۱۸۸)

---

(۱) الولاية تقبل التقييد و التعليق بالشرط (فتح القدير: ۷/۲۵۴ في اول كتاب القضاء، شاملة- شامي: ۸/۱۱۳ مطلب القضاء يقبل التقييد و التعليق)

(۲) قوله: (ويتخصص بزمان ومان وخصوم) عزاه في الاشباه الى الخلاصة وقال في الفتح من اول كتاب القضاء: الولاية تقبل التقييد و التعليق بالشرط كقوله: اذا وصلت الى بلدة كذا فأنت قاضيها و اذا وصلت الى مكة فأنت أمير الموسم، و الاضافة: كجعلت قاضيا في رأس الشهر، و الاستثناء منها كجعلتك قاضيا الا في قضية فلان و لا تنظر في قضية كذا، و الدليل عل جواز تعليق الامارة و اضافتها قوله صلى الله عليه وسلم حين بعث البعث الى مؤتة و أمر عليهم زيد بن حارث ان قتل زيد بن حارث فجعفر اميركم و ان قتل جعفر فعبد الله بن رواحة۔ و هذه القصة مما اتفق عليها جميع أهل السير و المغازی (شامی: ۸/۱۱۳، زکریا)

۴-۲۷ **ضابطہ**: ایسے اجتہادی مسائل جن میں نزاع کسی دنیوی مصلحت کی خاطر واقع نہیں ہوسکتا قضاء کا محل نہیں۔ (۱)

جیسے عبادات اوران کے اسباب وشرائط: یہ فتویٰ کا محل ہیں قضاء کا نہیں، پس یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ کسی نماز کے بارے میں قاضی فیصلہ کرے کہ کونسی نماز صحیح ہے اور کونسی فاسد اور کون سا پانی نجس ہے اور کون سا طاہر، پس ان معاملات میں قاضی کا حکم "حکم" نہیں بلکہ خبر ہے، دوسرے مفتی کو قاضی کے رائے کے خلاف فتویٰ دینے کا اختیار ہوگا۔

اسی طرح تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ میں ائمہ کے درمیان جن مسائل میں اختلاف ہوا ہے ان میں قاضی کا فیصلہ "رافع خلاف" نہیں ہوگا بلکہ یہ قاضی کی ایک رائے اور اس کا ذاتی فیصلہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً قرآن نے عدت تین قروء بتائی ہے، بعض ائمہ اس سے حیض اور بعض طہر مراد لیتے ہیں اب یہ نہیں ہوسکتا کہ قاضی کے فیصلے کے ذریعہ ان میں سے ایک متعین ہو جس کی پابندی سارے ہی لوگوں پر ضروری ہو، یعنی اگر قاضی کسی مقدمہ خاص میں عدت گذر جانے یا عدت کے باقی رہنے کا حکم حیض یا طہر کی بنیاد پر دے تو اس کی یہ تشریح اسی مخصوص مقدمہ کے ساتھ خاص ہوگی، دوسرے لوگوں پر اس کی پابندی لازم نہ ہوگی۔ اسی طرح عقائد کے متعلق جو اختلافات ہیں: ان مختلف فیہ عقائد کے بارے میں قاضی یہ حکم نہیں دے سکتا کہ فلاں عقیدہ صحیح ہے اور فلاں عقیدہ فاسد۔

البتہ بعض دفعہ عبادات کے بارے میں یا عقائد کے بارے میں دو مختلف رائے رکھنے والے دو گروہوں کے درمیان اختلاف مسلک اور اختلاف رائے پہلے مناظرہ پھر مجادلہ اور آخر میں تنازع کی شکل اختیار کرلے، تو یہاں پر چونکہ رفع نزاع فریضۂ قضاء ہے اس لئے قاضی ایسا حکم دے سکتا ہے جس سے تنازع ختم ہو۔ یہ علاحدہ امر ہے کہ ان فقہی یا کلامی اختلافات کے اندر کسی رائے کی ترجیح کا وہ حکم نہیں دے گا۔ مثلاً کسی مسجد میں دو مسلک وخیال کے لوگ نماز پڑھتے ہیں اور وہاں اس مسجد کی امامت کے

---

(۱) (اسلامی عدالت: ۱۶۴)

مسئلہ میں کوئی نزاع پیدا ہوجائے اور یہ نزاع جماعت کے ٹوٹنے اور باہمی فتنہ وفساد کا ذریعہ بنے تو ایسی صورت میں قاضی ایسا حکم دے سکتا ہے جو اس کے نزدیک جماعت مسلمین کو انتشار سے بچانے والا اور فتنہ وفساد کو دور کرنے والا ہو۔ (۱)

۳۷۴۔ **ضابطہ:** قضاء بعلم القاضی معتبر نہیں۔ (۲)

تشریح: یعنی اگر قاضی کو مدعی یا مدعی علیہ کے سچا ہونے کا ذاتی طور پر علم ہے تو۔ مدعی سے بینہ یا مدعی علیہ سے قسم لئے بغیر۔ محض اپنے علم کی بنیاد پر کسی کے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتا ہے اگر کیا تو وہ معتبر نہ ہوگا متاخرین کے نزدیک یہی معتمد ہے۔

ہاں قاضی اپنے علم کی بنیاد پر حدود کے مقدمات میں مجرم کو تنبیہ وتعزیر کرسکتا ہے جیسے کسی شرابی کو نشہ کی حالت میں دیکھ لیا تو اس کی تعزیر (سزا) جاری کرسکتا ہے لیکن حد نہیں لگائے گا کیونکہ حد شرعی وجہ سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح طلاق اور غصب کے معاملہ میں جب تک شرعی وجہ سے ثبوت نہ ہو حیلولت ثابت کرسکتا ہے یعنی طلاق دینے والے اور اس کی بیوی کے درمیان اسی طرح غاصب اور مال مغصوب کے درمیان حیلولت (رکاوٹ) پیدا کردے گا پس بیوی کو شوہر کے پاس جانے سے منع کردے گا اور مال مغصوب کو کسی امین کے پاس رکھوادے گا یہاں تک کہ شرعی وجہ سے اس مقدمہ کا ثبوت ہوجائے اور یہ سب طلب ثواب کے لئے کرے گا تاکہ شوہر عورت سے وطی نہ کرے اور غاصب مال مغصوب کو ہلاک نہ کردے؛ قضاء نہیں کرے گا یعنی طلاق اور غصب کو لازم کرنے کے طریقہ پر یہ حکم نہیں دے گا۔ (۳)

---

(۱) (ماخوذ: اسلامی عدالت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی: ۱۶۶-۱۶۴ ملخصاً بحوالہ الفروق للقرافی: ۴/۴۸-۴۸ تعلیق عبد الفتاح ابو غدۃ علی الاحکام: - ۶۴ فتاوی لابن تیمیہ تعلیق ابو غدۃ: ۲۵-۲۴) (۲) (الدر المختار: ۸/۱۴۰)

(۳) أن المعتمد عدم حكمه بعلمه في زماننا، اشباه (الدر المختار) وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى تحت قوله (ان المعتمد) أي عند المتأخرين ←

۷۴-**ضابطہ**: جو چیز ادائے شہادت کو مانع ہوتی ہے وہ قضاء کو بھی مانع ہوتی ہے۔[۱]

تفریع: پس اگر ادائے شہادت کے بعد قاضی کے فیصلہ سے قبل کوئی گواہ گونگا ہوگیا یا اندھا ہوگیا، یا فاسق ہوگیا، یا مرتد ہوگیا (نعوذ باللہ) تو اب قاضی اس گواہ کی گواہی پر فیصلہ نہیں کرسکتا، کیونکہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے شہادت کا ادا کرنا درست نہیں اور جو چیز ادا کو مانع ہوتی ہے وہ قضا کو بھی مانع ہوتی ہے۔[۲]

← لفساد قضاة الزمان وعبارة الأشباه الفتوى اليوم على عدم العمل بعلم القاضي في زماننا كما في جامع الفصولين (وبعد سطرين) هذا موافق لما مر عن الفتح من الفرق بين الحد الخالص لله تعالى وبين غيره ففي الأول لا يقضى اتفاقاً بخلاف غيره فيجوز القضاء فيه بعلمه وهذا على قول المتقدمين وهو خلاف المفتي به كما علمت۔ (شامی:۸/۱۴۰-۱۴۱)

لا يقضي بعلمه في الحدود الخالصة لله تعالى كزنا وخمر مطلقا غير أنه يعزر من به أثر السكر للتهمة وعن الامام ان علم القاضي في طلاق وعتاق وغصب يثبت الحيلولة على وجه الحسبة لا القضاء (الدر المختار) وفي الشامية: (قوله يثبت الحيلولة) أي بأن يأمر بأن يحال بين المطلق وزوجته والمعتق وأمته أو عبده والغاصب وما غصبه بأن يجعله تحت يد أمين الى أن يثبت ما علمه القاضي بوجه شرعي۔ (قوله على وجه الحسبة) أي الاحتساب وطلب الثواب لئلا يطأها الزوج أو السيد أو الغاصب۔ (قوله لا القضاء) أي لا على طريق الحكم بالطلاق أو العتاق أو الغصب۔ (شامی:۸/۱۴۱)

(۱)(بنایہ فی شرح الہدایہ:۸/۱۶۲)

(۲)وصار كما إذا خرس أو جن أو فسق بعد الأداء قبل العقد لا يقضي القاضي بشهادته، والأمر الكلي هذا أن ما يمنع الأداء منع القضاء، لأن المقصود ←

۴۷۵- **ضابطہ**: قضاء کا تعلق صرف مقضی علیہ سے ہوگا غیر کی طرف متعدی نہ ہوگا۔[1]

تشریح: جیسے قاضی نے صاحب قبضہ کے حق میں گھر کی ملکیت ثابت کر دی اور مدعی کے لئے عدم ملکیت کا فیصلہ کیا تو یہ عدم ملکیت کا فیصلہ صرف مدعی کے ساتھ خاص ہوگا غیر کی طرف متعدی نہ ہوگا کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ مدعی کی ملکیت ثابت نہ ہوسکی تو کسی اور کی ملکیت بھی ثابت نہیں ہوسکتی، چنانچہ اگر کوئی دوسرا شخص آکر اس گھر کا دعویٰ کرے اور ثبوت پیش کر دے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ کر دے گا۔

اسی طرح صحیح یہ ہے کہ کسی زمین یا مکان کے متعلق قاضی نے وقف کا فیصلہ کیا تو وہ بھی غیر کی طرف متعدی نہ ہوگا پس قاضی کے اس فیصلے کے بعد اگر کوئی شخص (فریق ثالث) اس موقوفہ شیء میں ملکیت کا دعویٰ کرے اور ثبوت پیش کر دے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ کر دے گا۔[2]

استثناء: مگر حریت اصلیہ، نسب، ولاء اور نکاح کے متعلق قاضی کا فیصلہ تمام لوگوں کی طرف متعدی ہوگا یعنی اگر قاضی نے کسی شخص کو اصلاً آزاد قرار دیا یا کسی مجہول النسب شخص کا نسب کسی معین شخص سے ثابت کیا یا ولاء عتاقہ کسی کے لئے ثابت کر دی یا کسی عورت کا نکاح کسی مرد کے ساتھ ہونے کا فیصلہ کیا تو ان چار صورتوں میں قاضی کا

← من أدائها القضاء وهذه الأشياء تمنع الأداء بالإجماع فمنع القضاء. والعمى بعد التحمل يمنع الأداء عندهما (أى عند الطرفين) فيمنع القضاء. (بنایہ فی شرح الہدایہ: ۸/ ۱۶۲)

(۱) القضاء يقتصر على المقضى عليه ولا يتعدى الى غيره (قواعد الفقہ، ص: ۹۸، قاعدہ: ۲۱۲؛ الأشباه والنظائر ص: ۱۸۴، بیروت)

(۲) ولا يتعدى فى الوقف على الأصح وقدمناه فى باب الاستحقاق من البيوع. (البحر الرائق: ۶/ ۲۸۲، شاملہ)

فیصلہ تمام لوگوں کی طرف متعدی ہوگا پس پہلی صورت میں کوئی شخص مقضی لہ پر غلام ہونے کا اور دوسری صورت میں نسب کا اور تیسری صورت میں ولاء عتاقہ کا اور چوتھی صورت میں اس عورت کے ساتھ نکاح کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ قاضی کا مذکور فیصلہ سب کے حق میں لازم ہوچکا ہے۔[۱]

۴۷۶- **ضابطہ**: قاضی کا فیصلہ اپنے حق میں اور ہر اس شخص کے حق میں جائز نہیں جس کے لئے اس کی شہادت معتبر نہیں۔

تشریح: آدمی کی شہادت اپنے اصول، فروع، بیوی اور تجارتی پارٹنرز وغیرہ کے حق میں قبول نہیں ہوتی (جیسا کہ کتاب الشہادت میں ضابطہ: ۴۳۹ میں تفصیل گزر چکی ہے) اور قضاء کی بنیاد شہادت پر ہے لہٰذا ان رشتہ داروں و متعلقین کے حق میں قضاء (فیصلہ) بھی صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس میں تہمت کا امکان ہے [ہاں ان کے خلاف فیصلہ کیا تو فیصلہ صحیح ہے جیسا کہ شہادت ان کے خلاف صحیح ہے]

اور اصول فروع کے علاوہ دیگر قرابت دار جیسے بھائی، بہن وغیرہ کے حق میں شہادت معتبر ہے تو ان کے حق میں فیصلہ بھی معتبر ہوگا۔[۲]

۴۷۷- **ضابطہ**: قضاء ضمنی کے لئے دعویٰ وخصومت شرط نہیں۔[۳]

تفریعات:

(۱) پس جب گواہوں نے خصم کے خلاف کسی حق کی شہادت دی اور اس میں اس کا

(۱) ویتعدی فی القضاء بالحریة والنسب والولاء والنکاح۔ (البحر الرائق: ۶/ ۲۸۲، شاملہ-الأشباہ والنظائر: ۱/ ۱۸۴، شاملہ)

(۲) ولا یجوز قضاؤہ لنفسہ ولا لمن لا تقبل شہادتہ لہ، لأن مبنی القضاء علی الشہادة، ولا یصح شاہدا لهؤلاء فلا یصح قاضیا لهم لمکان التہمة، ویجوز أن یقضی علیهم، لأنہ لو شہد علیهم جاز فکذا القضاء. (معین الحکام: ۱/ ۳۵)

(۳) القضاء الضمنی لا یشترط لہ الدعوی والخصومة الخ (شامی: ۸/ ۱۲۰)

نام اور اس کے باپ اور دادا کا نام بیان کیا اور قاضی نے مدعی کے لئے اس حق کا فیصلہ کرلیا تو-اگرچہ یہ مقدمہ نسب کا نہیں ہے- ضمناً نسب کا بھی فیصلہ متصور ہوگا، کیونکہ ضمناً جو چیز ثابت ہوتی ہے اس میں دعویٰ اور خصومت کی ضرورت نہیں رہتی، ہاں اگر نسب کا مقدمہ اصالۃً ہوتا تو بغیر دعویٰ اور خصومت کے نسب کا فیصلہ درست نہ ہوتا — لیکن حمویؒ نے وضاحت کی ہے کہ مذکورہ نسب کا ثبوت اس وقت ہوگا جبکہ مشہود علیہ (جس کے خلاف شہادت پیش کی گئی ہے) غیر مشار الیہ ہو اگر مشار الیہ ہے تو اس کا نسب ثابت نہ ہوگا، کیونکہ اشارہ سے جب معین کردیا جاتا ہے تو اس وقت تسمیہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے (فافہم)[1]

(۲) اسی طرح گواہوں نے کہا: فلانی عورت فلاں کی بیوی ہے اور اس نے اپنے شوہر کو فلاں مقدمہ میں خصم منکر کے خلاف وکیل مقرر کیا ہے اور قاضی نے اس کی توکیل کا فیصلہ کرلیا تو ساتھ میں دونوں کی زوجیت کا بھی ضمناً فیصلہ ہوجائے گا۔[2]

(۳) مدعی نے کسی شخص پر کفالت بالمال کا دعویٰ کیا اور کہا کہ: یہ شخص فلاں کا اس کی اجازت سے کفیل ہے، اس شخص نے کفالت کا اقرار کیا لیکن دین کا انکار کیا یعنی کہا میں کفیل تو ہوں مگر یہ شخص جس دین کا دعویٰ کرتا ہے وہ صحیح نہیں، تو مدعی نے دین پر ثبوت پیش کردیا اور قاضی نے اس کفیل کے خلاف فیصلہ کردیا تو قاضی کا یہ فیصلہ کفیل کے

---

(۱) فاذا شهدا على خصم بحق وذكرا اسمه واسم أبيه وجده، وقضى بذلك الحق كان قضاء بنسبه ضمنا وان لم يكن في حادثة النسب اه أي اذا كان المشهود عليه غير مشار ليه، فلو مشارا اليه لا يثبت نسبه كما وضحه الحموي (شامی:۸/۱۲۰)

(۲) ثم قال في الأشباه: وعلى هذا لو شهدا بأن فلانة زوج فلان، وكلت زوجها فلانا في كذا على خصم منكر، وقضى بتوكيلها كان قضاء بالزوجية بينهما۔ (شامی:۸/۱۲۱)

خلاف قصداً (اصالتاً) ہوگا اور اصیل کے خلاف ضمناً ہوگا، پس اب کفیل جو مال ادا کرے گا وہ اصیل سے بعد میں رجوع کرے گا، اس میں اصیل کو قاضی کے مذکور فیصلہ کی وجہ سے انکار کا کوئی حق نہ ہوگا۔[1]

۴۷۸- **ضابطہ:** قاضی کو اپنے فیصلے سے -جبکہ فیصلہ موافق شرع ہو- رجوع جائز نہیں۔[2]

تشریح: پس اگر قاضی نے شرعی شرائط کے موافق فیصلہ کرلیا تو اس کے بعد اس کا یہ کہنا کہ میں اپنے فیصلہ سے رجوع کرتا ہو، یا مجھے گواہوں میں التباس ہوگیا ہے، یا اپنا فیصلہ باطل کرتا ہوں تو یہ صحیح نہیں اور اس کا فیصلہ جاری رہے گا۔[3]

مستثنیات: مگر تین صورتوں میں قاضی اپنے فیصلے سے رجوع کرسکتا ہے:

۱- قاضی نے اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کیا پھر بعد میں اس کے خلاف ظاہر ہوا مثلاً ایک شخص نے قاضی کے پاس دوسرے کے لئے کچھ رقم کا اقرار کیا پھر دونوں (مقر اور مقرلہ) غائب ہوگئے اس کے بعد دوسرے دو شخص ایسا ہی مقدمہ لے کر قاضی کے پاس آئے اور قاضی نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ پہلے ہی دو شخص ہیں ایک کے خلاف فیصلہ کردیا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ معترف کوئی اور شخص تھا تو اپنے اس فیصلے سے رجوع کرسکتا ہے [لیکن اب فساد زمان کی وجہ سے متاخرین کا فتوی اس بات پر ہے کہ

---

(۱) واصل القضاء الضمني ما ذكره أصحاب المتون من أنه لو ادعى كفالة على رجل بمال باذنه فأقر بها، وأنكر الدين فبرهن على الكفيل بالدين وقضى عليه بها كان قضاء عليه قصدا وعلى الأصيل الغائب ضمناً۔ (شامی: ۸/۱۲۱)

(۲) لايصح رجوع القاضي عن قضائه اذا كان مع شرائط الصحة (قواعد الفقه ص:۱۱۱، قاعدة:۲۷۵)

(۳) فلو قال رجعت عن قضائي و وقعت في تلبيس الشهود و بطلت حكمي لم يصح و القضاماض كما في الخانية۔ (شامی: ۸/۱۱۹، زکریا)

قضاء بعلم القاضی معتبر نہیں یعنی قاضی نے اپنے علم کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا تو معتبر نہ ہوگا جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا، پس اس اعتبار سے یہ صورت مستثنیٰ میں داخل نہ ہوگی کیونکہ جب قاضی کا یہ فیصلہ معتبر نہیں تو رجوع کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اصل مسلک کے اعتبار سے اس کو مستثنیٰ کیا گیا ہے][1]

۲-قاضی نے طلاق کا یا مال وغیرہ کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ بینہ سے یا مقضی لہ کے اقرار سے غلط ثابت ہوا مثلاً یہ ظاہر ہوا کہ گواہ غلام تھے یا کافر تھے یا محدود فی القذف تھے یا مقضی لہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا یعنی کہا میں غلطی پر ہوں اور فریق مخالف حق پر ہے تو ایسی صورت میں قاضی اپنے فیصلے سے رجوع کرلے گا کیونکہ اس صورت میں اس کا فیصلہ باطل ہوجاتا ہے، پس عورت کو شوہر کے حوالہ کردے گا اور مال جس سے لیا تھا اس کو واپس کردے گا (لیکن یہ اسی وقت ہے جبکہ قاضی کی خطا بینہ سے یا مقضی لہ کے اقرار سے ثابت ہو جیسا کہ بیان ہوا خود قاضی کے اقرار سے ثابت ہو تو اس میں رجوع کا حق نہیں ہے، اس کی نظیر شاہدین کا شہادت سے رجوع کرنا ہے کہ اس میں قاضی کا فیصلہ برقرار رہتا ہے ٹوٹتا نہیں ہے ہاں نقصان کی صورت میں شاہدین پر ضمان آتا ہے اسی طرح یہاں پر بھی خود قاضی جب خطا کا اقرار کرے تو اس کا فیصلہ ٹوٹے گا نہیں لیکن اگر جان بوجھ کر غلط فیصلہ کیا ہے تو نقصان کا ضمان اس پر لازم ہوگا بلکہ ایسا قاضی معزول کئے جانے کا مستحق ہے)[2]

---

(۱) قوله (ولو بعلمه) كما اذا اعترف عنده شخص لآخر بمبلغ وغابا عنه، ثم تداعي عنده الثان فحكم على أحدهما ظانا أنه ذلك المعترف، ثم تبين له أنه غيره له نقضه وتمامه في شرح الوهباني، وهذا مبنى على أن للقاضى العمل بعلمه والفتوى على عدمه في زماننا ما نقله في الأشباه عن جامع الفصولين، وقيد بزماننا لفساد القضاة فيه، وأصل المذهب الجواز۔ (شامی:۸/۱۱۹،زکریا)

(۲) فان أخطا...بأن قضى بمال أو صدقة أو بطلاق أو عتاق ثم ظهر أن ←

۳- مجتہد قاضی جب مختلف فیہ مسئلہ میں اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ کرے تو اس میں اس کا رجوع صحیح ہے بلکہ رجوع ضروری ہے کیونکہ مذہب کے خلاف قاضی کا فیصلہ نافذ ہی نہیں ہوتا خواہ قاضی مجتہد ہو یا مقلد جیسا کہ علامہ شامیؒ نے اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے اخیر میں اسی کو راجح قرار دیا ہے۔(۱)

۴۷۹- **ضابطہ:** قسم سے انکار پر قاضی کا فیصلہ جھوٹی شہادت پر فیصلہ کے مانند ہے۔(۲)

تشریح: مدعی کے پاس گواہ نہیں تھے اور مدعی علیہ سے جب قسم کا مطالبہ کیا تو وہ قسم سے باز رہا یعنی خاموش رہا یا صراحتاً قسم سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے قاضی نے

← الشهود عبيد أو كفار أو محدودون في القذف فانه يبطل ذلك القضاء ويرد العبد رقيقا ويرد المرأة الى زوجها ويرد المال الى من أخذ منه...وهذا كله اذا ظهر خطأ القاضي بالبينة و باقرار من المقضى له۔فاما اذا ظهر ذلك باقرار القاضي لا يظهر ذلك في حق المقضى له حتى لا يبطل قضائه في حق المقضى له،لأن حق المقضى له قد تعلق بذلك و القاضي بما قال يريد ابطاله۔ وهو نظير الشاهد اذا رجع عن شهادته لا يعمل رجوعه في حق المقضى له لا ينقضي القضاء ولكن الشاهد يضمن كذا هنا(المحيط البرهاني: ۸/ ۵۲-ہندیہ: ۳/ ۳۴۲- شامی: ۸/ ۱۱۲-۱۱۹)

(۱) قضى في مجتهد فيه بخلاف رأيه أي مذهبه لا ينفذ مطلقاً(الدر المختار) وفي الشامية تحت قوله لا ينفذ مطلقا:...."قال في الفتح :.....عندهما لا ينفذ... والفتوى على قولهما وذكر في الفتاوى الصغرى أن الفتوى على قوله فقد اختلف في الفتوى والوجه في هذا الزمان أن يفتى بقولهما .....اذ قصارى الأمر أن هذا منزل منزلة الناسي لمذهبه وقد مر عنهما في المجتهد أنه لا ينفذ فالمقلد أولى"۔(شامی: ۸/ ۹۷-۱۱۹)

(۲) القضاء بالنكول كالقضاء بشهادة الزور۔(قواعد الفقہ ص: ۹۸، قاعدہ: ۲۱۳)

مدعی کے حق میں فیصلہ کردیا تو قاضی کا یہ فیصلہ ایسا متصور ہوگا گویا جھوٹی شہادت پر فیصلہ کیا گیا ہو یعنی جس طرح انجانے میں جھوٹی شہادت کے ذریعہ فیصلہ عقود (بیع، نکاح) اور فسوخ (اقالہ اور طلاق) میں ظاہراً و باطناً نافذ ہوجاتا ہے اسی طرح قسم سے باز رہنے کی وجہ سے بھی قاضی کا فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہوجائے گا۔

ظاہراً نفاذ کا مطلب ہے کہ مثلاً کسی عورت کے لئے کسی مرد کی بیوی ہونے کا فیصلہ کیا تو قاضی اس عورت کو مرد کے حوالہ کردے گا اور اس کیلئے نفقہ وغیرہ کا فیصلہ کرے گا، اور باطناً نفاذ سے مراد ہے قاضی کے اس فیصلے کے بعد مرد کے لئے اس عورت سے وطی کرنا جائز ہوگا اور عورت کے لئے بھی اپنے پر شوہر کو قدرت دینا حلال ہوگا اور اولاد ثابت النسب ہوگی یہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے، جبکہ صاحبینؒ، امام زفرؒ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فیصلہ کا نفاذ صرف ظاہراً ہوگا باطناً نہ ہوگا صاحب درمختار نے شرنبلالیہ کے حوالہ سے اس پر فتوی نقل کیا ہے لیکن علامہ شامی نے اس پر رد کیا ہے اور امام صاحب کا قول راجح قرار دیا ہے۔[1]

---

(۱) فنکل فقضی علیه بالنکول تحل الجارية للمدعی دیانة وقضاء کما فی شهاد الزوراه، فعل هذا القضاء بالنکول کالقضاء بشهادة الزوراه.

قوله: (ظاهرا وباطنا) المراد بالنفاذ ظاهرا أن يسلم القاضی المرأة إلی الرجل، ويقول سلمی نفسک إليه فإنه زوجک ويقضی بالنفقة والقسم وبالنفاذ باطنا أن يحل له وطؤها ويحل لها التمکين فيما بينهما وبين الله تعالی (شامی: ۸/ ۹۴)

(وينفذ القضا بشهاد الزور ظاهرا وباطنا) حيث کان المحل قابلا والقاضی غير عالم بزورهم (فی العقود) کبيع ونکاح (والفسوخ) کإقالة وطلاق، لقول علی رضی الله عنه لتلک المرأة: شاهداک زوجاک، وقالا وزفر والثلاثة ظاهرا فقط وعليه الفتوی شرنبلالية عن البرهان۔

←

لیکن خیال رہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک باطناً نفاذ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آخرت میں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا، آخرت کا مطالبہ دوسری چیز ہے اس کو آخرت میں ضرور سزا ملے گی مگر دنیوی احکام میں عورت اس کے لئے حلال ہوجائیگی، اسی طرح قاضی نے اس کے لئے کسی چیز کا فیصلہ کیا ہو تو وہ شخص دنیا میں اس چیز کا مالک ہوجائے گا اور اسی اعتبار سے احکام جاری ہوں گے مگر آخرت میں مؤاخذہ ضرور ہوگا۔

فائدہ: مدعیٰ علیہ کے قسم سے باز رہنے پر مناسب ہے کہ قاضی فوراً اس کے خلاف فیصلہ نہ کرے بلکہ اس سے کل تین مرتبہ (یعنی پہلی بار کے بعد اور دودفعہ) یمین کا مطالبہ کرے اور ہر مرتبہ کہے کہ اگر تم نے قسم نہیں کھائی تو تمہارے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا اگر تینوں مرتبہ قسم سے باز رہتا ہے تو اب اس کے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا۔ اور یہ تین مرتبہ کا مطالبہ احتیاط کی بنا پر اور اتمام حجت کیلئے ہے ورنہ پہلی ہی دفعہ قسم سے باز رہنے پر قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے یہی صحیح ہے۔[1]

۴۸۰۔**ضابطہ**: قضاء الزام میں قاضی نے جس کے خلاف فیصلہ کیا اس کا کوئی دعویٰ اور بینہ اس واقعہ میں قبول نہیں کیا جائے گا۔[2]

→ وفي الشامية:قوله: (وعليه الفتوى)نقله أيضا في القهستاني عن الحقائق، وفي البحر عن أبي الليث لكن قال: وفي الفتح من النكاح، وقول أبي حنيفة هو الوجه۔

قلت: وقد حقق العلام قاسم في رسالته قول الإمام بما لا مزيد عليه ثم أورد عليه إشكالا، وأجاب عنه وعليه المتون. (شامی: ۸/ ۹۴)

(۱) وينبغي للقاضي أن يقول له إني أعرض عليك اليمين ثلاثا فإن حلفت وإلا فقضيت عليك بما ادعاه..إلى قوله فأما المذهب أنه لو قضى بالنكول بعد العرض مرة جاز لما قدمناه هو الصحيح والأول أولى۔ (ہدایہ: ۳/ ۲۰۴)

(۲) المقضي عليه في حادثة لا تسمع دعواه ولا بينة۔ (قواعد الفقہ ص: ۱۲۸، قاعدہ: ۳۴۵)

تشریح: جیسے بائع نے بینہ سے یہ ثابت کر دیا کہ مشتری نے مجھے ثمن ادا نہیں کیا ہے اور قاضی نے مشتری کے خلاف فیصلہ کر دیا تو اب مشتری کا کوئی دعویٰ اور بینہ ثمن کی ادائیگی کے بابت قبول نہیں جائے گا، اسی طرح زمین، دکان، مکان وغیرہ میں اختلاف ہوا اور قاضی نے ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف فیصلہ کیا تو جس کے خلاف فیصلہ کیا ہے اس کی اب کوئی شنوائی نہ ہوگی۔

لیکن یہ حکم قضاء الزام میں ہے یعنی قاضی نے جس کے خلاف فیصلہ کیا اس پر کوئی چیز لازم کی ہو جیسے مذکورہ بالا مثال میں مشتری پر ثمن لازم کیا گیا ہے اس قضاء کو ''قضاء استحقاق اور قضاء ملک'' بھی کہا جاتا ہے؛ قضاء ترک کا یہ حکم نہیں ہے۔ قضاء ترک یہ ہے کہ مثلاً قاضی نے فیصلہ مدعیٰ علیہ کے حق میں کیا اور مدعی کو کہا کہ تیرا اس پر کوئی حق نہیں ہے اب اس سے تو کوئی معارضہ نہیں کرے گا یعنی گویا اس میں مدعی سے مقدمہ کے ترک کا حکم کرتا ہے کوئی چیز اس پر لازم نہیں کرتا ہے۔ اس میں قاضی کے فیصلے کے بعد بھی مقضی علیہ یعنی جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے کیلئے حق مخاصمت باقی رہتا ہے۔

ان دو قضاء میں وجہ انحصار یہ ہے کہ مدعی یا محق ہوگا یا مبطل (یعنی اپنا حق ثابت کر سکا ہوگا یا نہیں کر سکا ہوگا) پس اگر محق ہے تو قاضی کا فیصلہ (مدعی علیہ کے خلاف) ''قضاء الزام'' ہوگا اور اگر مبطل ہے تو قاضی کا فیصلہ (مدعی کے خلاف) ''قضاء ترک'' ہوگا۔ آسان الفاظ میں: قاضی نے مدعیٰ علیہ کے ذمہ کوئی چیز لازم کی تو یہ قضاء الزام ہے اور اگر مدعی سے مقدمہ ترک کرنے کو کہا تو یہ قضاء ترک ہے۔

اور حکم کے اعتبار سے قضاء الزام اور قضاء ترک میں فرق یہ ہے کہ قضاء الزام میں جو مقضی علیہ ہوا ہے وہ کبھی بھی اس حادثہ میں مقضی لہ نہیں بن سکتا ہے قاضی کا فیصلہ اس کے حق میں اٹل رہتا ہے، جبکہ قضاء ترک میں مقضی علیہ مقضی لہ بن سکتا ہے؛ دوسرا فرق یہ ہے کہ فریق ثالث اگر یہ دعویٰ کرے کہ جس مال کا اس کیلئے فیصلہ کیا گیا ہے وہ میرا ہے تو قضاء ترک میں تو اس کا یہ دعویٰ سنا جائے گا، قضاء الزام میں سنا

نہیں جائے گا۔[1]

۲۸۱- **ضابطہ:** قاضی کا فیصلہ جب اجماع کے خلاف ہو تو نافذ نہ ہوگا۔[2]

فائدہ: اگر قاضی اپنے مذہب کے مرجوح قول پر فیصلہ کرے تو نافذ ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے علامہ شامیؒ نے رسم المفتی اور شامی میں بحث وتمحیص کے بعد لکھا ہے کہ اگر قاضی مجتہد ہے تو اس کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا؛ مقلد محض قاضی کا فیصلہ مرجوح قول پر نافذ نہ ہوگا، گویا مرجوح قول پر اس کا فیصلہ اجماع کے خلاف

(۱) وهو على قسمين: القسم الأول: هو الزام القاضي المحكوم به على المحكوم عليه بكلام قوله حكمت أو أعط الشي الذي ادعى به عليك ويقال له قضاء الالزام وقضاء الاستحقاق۔ والقسم الثاني: هو منع القاضي المدعي عن المنازعة بكلام كقوله ليس لك حق أو أنت ممنوع عن المنازعة ويقال لهذا قضاء الترك۔

وهذا الحكم على قسمين ووجه الانحصار هو ان المدعي اما أن يظهر محقا في دعواه أو مبطلا فاذا ظهر محقا يقضي له بقضاء الاستحقاق، واذا ظهر مبطلا يقضي له بقضاء الترك۔

والفرق بين قضاء الاستحقاق وقضاء الترك على وجهين: الوجه الاول: ان المقضي عليه بقضاء الاستحقاق في حادثة لا يكون مقضيا له أبدا في تلك الحادثة، أما المقضي عليه بقضاء الترك في حادثة فيجوز أن يقضي له اذا أثبت دعواه بالبينة في تلك الحادثة۔ الوجه الثاني: اذا ادعى الشخص الثالث بأن المحكوم به هو ماله فتسمع دعواه۔ (درر الحكام في شرح المجلة: ۱۳/ ۲۲-۲۳ مكتبه شاملة)

(۲) اذا قضي بشيء مخالف للإجماع لا ينفذ۔ (قواعد الفقه ص: ۵۷، قاعده: ۲۴ شامي: ۸/ ۹۸)

فیصلہ شمار ہوگا۔[1]

۲۸۲- ضابطہ: قاضی کا کسی ایسے اجنبی سے ہدیہ قبول کرنا جو قضا سے پہلے ہدیہ نہیں دیتا تھا جائز نہیں اور اپنے قرابت داروں سے قبول کرنا جائز ہے۔[2]

تشریح: ضابطے میں اجنبی کے ساتھ "جو قضا سے پہلے ہدیہ نہیں دیتا تھا" کی قید لگائی گئی، کیونکہ جو شخص عہدۂ قضا سے پہلے ہدیہ دیا کرتا تھا تو اس سے قبول کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر عدالت میں اس کا کوئی مقدمہ ہے تو قاضی اس کا بھی ہدیہ قبول نہیں کرے گا اور اگر کوئی مقدمہ اس کا نہیں ہے تو اتنا ہی ہدیہ جتنا کہ پہلے دیا کرتا تھا یا اس سے کم ہدیہ قبول کرسکتا ہے، زیادہ قبول کرنا جائز نہیں یعنی اگر زیادہ ہے تو جس قدر زیادہ ہے وہ واپس کردے۔

اور قاضی اپنے قرابت دار یعنی ذی رحم محرم سے مطلقاً ہدیہ قبول کرسکتا ہے اس میں

---

(۱) وتقييد السلطان له بذلك غير قيد لما قاله العلامة قاسم في تصحيحه من أن الحكم والفتوى بما هو مرجوح خلاف الاجماع اه ـ وقال العلامة قاسم في فتاواه: وليس للقاضي المقلد أن يحكم بالضعيف لأنه ليس من أهل الترجيح فلا يعدل عن الصحيح الا لقصد غير جميل ولو حكم لا ينفذ لأن قضاءه قضا بغير الحق لأن الحق هو الصحيح وما وقع من أن القول الضعيف يتقوى بالقضاء المراد به قضاء المجتهد كما بين في موضعه اه ـ وقال ابن الغرس وأما المقلد المحض فلا يقضي الا بما عليه العمل والفتوى اه ـ وقال صاحب البحر في بعض رسائله: أما القاضي المقلد فليس له الحكم الا بالصحيح المفتى به في مذهبه ولا ينفذ قضاؤه بالقول الضعيف اه ـ ومثله ما قدمه الشارح أول كتاب القضاء وقال: وهو المختار للفتوى كما بسطه المصنف في فتاويه وغيره الخ (شامي: ۸/ ۹۸- ۹۹، مكتبه زكريا- رسم المفتي: ۶۹ تا ۷۲، دار الكتاب ديوبند)

(۲) لا يقبل الهدى من الأجنبي إذا كان لا يهدى إليه قبل القضاء۔ (معين الحكام: ۱/ ۱۵، المكتبة الشاملة، شامي: ۸/ ۴۸)

کوئی حرج نہیں ہے، محیط میں یہی بیان کیا گیا ہے۔

لیکن قاضی علاء الدین طرابلسی نے اپنے زمانہ کے حالات دیکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اصوب یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں مطلقاً ہدیہ قبول نہ کیا جائے کیونکہ "ہدیہ" مہدی کی چاپلوسی اور مہدی الیہ کی چشم پوشی کو پیدا کرتا ہے جس کا فساد ظاہر ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ ہدیہ حکمت کے نور کو بجھا دیتا ہے، مشہور محدث حضرت ربیعہ۔امراء وقضاۃ کو نصیحت کرتے ہوئے۔فرماتے ہیں: ہدیہ سے بچا کرو کیونکہ یہ رشوت کا ذریعہ ہے اور نبی کریم ﷺ جو ہدیہ قبول فرماتے تھے تو یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ آپؐ معصوم تھے ان قبائح سے بچے ہوئے تھے جو دوسروں کو پیش آتی ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو جب ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ نے رد فرما دیا، سوال کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ تو ہدیہ قبول فرماتے تھے اور آپ کیوں رد کر دیتے ہیں؟ تو جواب دیا: وہ آپ ﷺ کے لئے تو ہدیہ تھا لیکن یہ ہمارے لئے رشوت ہے کیونکہ نبی ﷺ کو نذرانہ آپ کی نبوت کی وجہ سے پیش کیا جاتا تھا اور ہمیں ہماری ولایت (عہدہ) کی وجہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

نیز حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں ہدیہ کے نام سے رشوت کو حلال سمجھا جائے گا۔ (انتہی کلام الطرابلسی)[1]

فائدہ: یہی حکم دعوت قبول کرنے کا ہے پس جن کے ساتھ سابقہ معرفت ہے یا

---

(۱) وإن كان يهدى إليه قبل القضاء فإن كان له خصومة لا ينبغي له أن يقبل، نص عليه الخصاف، فإن لم يكن له خصومة فإن كانت هذه الهدية مثل تلك أو أقل فإنه يقبلها؛ لأنه لا يكون آكلا بقضائه؛ لأن سابقة المهاداة دلت على الإهداء للتودد والتحبب لا للقضاء، وإن كان أكثر يرد الزيادة؛ لأنه إنما زاد لأجل القضاء ليميل إليه متى وقعت الخصومة ويقبل الهدية من ذي الرحم المحرم، من المحيط قلت: والأصوب في زماننا عدم القبول مطلقا لأن الهدى تورث ←

عام دعوت ہے اس کو قاضی قبول کر سکتا ہے اور عام دعوت یہ ہے کہ قاضی شریک ہو یا نہ ہو دعوت وقت پر ہوگی اور جو دعوت قاضی کی شرکت پر موقوف ہو وہ خاص دعوت ہے اس کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔[1]

۲۸۳- **ضابطہ**: قضاء علی الغائب بضرورت جائز ہے (اور ضرورت کا مدار قاضی کی صواب دید پر ہے)

تشریح: احناف کا اصل مسلک یہ ہے قضاء علی الغائب جائز نہیں مدعیٰ علیہ کا عدالت میں حاضر ہونا ضروری ہے اس کے بغیر قاضی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا ہے، لیکن متاخرین علماء نے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر بوقت ضرورت قضاء علی الغائب کو جائز قرار دیا ہے۔

اور ضرورت کا مدار قاضی کی صوابدید پر ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے "ولا یجوز القضاء علی الغائب الا اذا رأی القاضی مصلحة فی الحکم له و علیه فحکم" پس جہاں قاضی قضاء علی الغائب میں مصلحت سمجھے کہ فیصلہ نہ کرنے میں مدعی کا حق ضائع ہونے کا یا معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے تو فیصلہ کرے۔ لیکن اولا مدعی

← إدلال المهدی وإغضاء المهدی إلیه، وفی ذلک ضرر القاضی ودخول الفساد علیه۔ وقیل ان الهدی تطفئ نور الحکمة۔ قال ربیعة إیاک والهدیة فإنها ذریعة الرشوة وکان النبی علیه الصلاة والسلام یقبل الهدیة وهذا من خواصه والنبی علیه الصلا والسلام معصوم مما یتقی علی غیره منها. ولما رد عمر بن عبد العزیز الهدیة قیل له: کان رسول الله یقبلها. فقال: کانت له هدیة ولنا رشوة لأنه کان یتقرب إلیه لنبوته لا لولایته، ونحن یتقرب إلینا للولایة. وقال علیه الصلا والسلام یأتی علی الناس زمان یستحل فیه السحت بالهدیة الخ (معین الحکام: ۱/۱۵)

(۱) (تحفة الالمعی: ۳/۲۶۲- درر الحکام فی شرح المجلة: ۱۳/۱۰۵)

علیہ کے پاس حکم (سمن) بھیجے گا اگر وہ باوجود حکم کے حاضری سے گریز کرتا ہے تو اسے دفع الزام سے عاجز تصور کر کے مدعی سے اس کے دعویٰ پر ثبوت کا مطالبہ کرے گا اگر مدعی اپنا ثبوت بینہ کے ذریعہ پیش کر دیتا ہے اور ادھر کوشش بلیغ کے باوجود مدعی علیہ کو حاضر کرنا متعذر ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں قاضی مقدمہ کا فیصلہ کر لے گا اور یہ فیصلہ بوجہ ضرورت جائز ہے۔ لیکن فیصلہ سے قبل قاضی مدعلی علیہ کی طرف سے کسی ایسے شخص کو وکیل مقرر کرے گا جس کے متعلق امید ہو کہ وہ اس کے حقوق ومفادات کی حفاظت کرے گا ایسے شخص کو فقہ کی اصطلاح میں ''وکیل مسخر'' کہا جاتا ہے۔[۱]

اگر مدعی علیہ کہیں دور دراز ایسی جگہ غائب ہے کہ وہاں حکم بھیجنا ممکن نہ ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے کہ بغیر حکم بھیجے قاضی حسب سابق مذکور کاروائی کرے۔[۲]

عہدۂ قضاء سے معزولی کا بیان

۴۸۴- **ضابطہ**: ہر وہ عیب جو ابتداء عہدۂ قضاء کے لئے مانع ہے انتہاءً بھی مانع ہے۔[۳]

تشریح: پس نابینا ہونا، بہرا ہونا، یا ایسا دائمی مرض پیدا ہونا جو کار قضاء کے انجام دہی سے معذور کر دے، یہ سب عیوب ابتداً مانع ہیں تو انتہاءً بھی مانع ہوں گے یعنی عہدۂ قضا کے بعد طاری ہونے سے قاضی خود بخود معزول ہو جائے گا۔

لیکن عارضی مرض یعنی جس مرض سے صحت یاب ہونے کی توقع ہے اس سے معزول نہ ہوگا کیونکہ یہ مرض ابتداء قضا کے لئے مانع نہیں ہے تو انتہاءً بھی مانع نہ ہوگا۔ اسی طرح فسق سے بھی معزول نہ ہوگا، کیونکہ احناف کے یہاں فسق ابتداء مانع نہیں

(۱) (مستفاد: شامی: ۸/۱۰۷، زکریا- اسلامی عدالت: ۳۸۲- احسن الفتاویٰ: ۵/۱۴-۱۹۷/۷)

(۲) (احسن الفتاوی: ۵/۴۱۴ کتاب النکاح، حکم غائب غیر مفقود)

(۳) (مستفاد: البحر الرائق: ۶/۲۸۲، شاملہ)

فاسق بھی قاضی بنایا جاسکتا ہے تو انتہاء بھی مانع نہ ہوگا، البتہ امیر المؤمنین کا فریضہ ہے کہ فاسق کو قاضی نہ بنائے اور عہدۂ قضا کے بعد کوئی فاسق ہوا ہے تو اس کو معزول کردے، اگر امیر نے - باوجود عدم مجبوری وحرج کے - ایسا نہیں کیا تو وہ گنہگار ہوگا۔ (۱)

۴۸۵- **ضابطہ**: ہر وہ چیز جس سے وکیل معزول ہوجاتا ہے قاضی معزول ہوجاتا ہے۔ (۲)

جیسے:

(۱) موکل نے وکیل کو وکالت سے معزول کردیا تو وکیل معزول ہوجاتا ہے تو اسی طرح سلطان نے قاضی کو مستعفی کردیا تو قاضی معزول ہوجائے گا (لیکن اس صورت میں قاضی اس وقت معزول شمار ہوگا جب کہ اس کو معتبر ذرائع سے معزولی کی اطلاع پہنچے، اس سے پہلے اس نے جو مقدمات حل کئے ہوں گے وہ صحیح شمار ہوں گے جیسا کہ وکیل کا حکم ہے) (۳)

(۲) موت سے وکیل معزول ہوجاتا ہے تو قاضی بھی اپنی موت سے معزول ہوجائے گا۔

(۳) جنون (پاگل پن سے) وکیل معزول ہوجاتا ہے تو قاضی بھی معزول ہوجائے گا۔

---

(۱) والفاسق أهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا أنه لا ينبغي أن يقلد كما في حكم الشاهدة...ولو أن القاضي عدلا ففسق بأخذ الرشوة وغيره لا ينعزل ويستحق العزل وهذا هو ظاهر المذهب وعليه مشايخنا رحمهم الله تعالى (هدايه على هامش البناية: ۹/ ۷- مكتبه شاملة)

(۲) كل ما يخرج به الوكيل عن الوكالة يخرج به القاضي عن القضاء (بدائع الصنائع: ۷/ ۱۶، شاملہ)

(۳) واذا عزل السلطان القاضي لا ينعزل مالم يصل اليه الخبر كالوكيل۔ (البحر الرائق: ۶/ ۲۸۲، شاملہ)

(۵) مرتد ہو کر دار الحرب میں چلے جانے سے وکیل معزول ہو جاتا ہے تو قاضی بھی معزول ہو جائے گا (لیکن نفس ارتداد سے قاضی معزول نہ ہوگا بلکہ دار الحرب میں چلے جانے کے بعد معزول ہوگا پس اس سے پہلے دوبارہ اسلام لے آیا تو اپنے عہدہ پر برقرار رہے گا جیسا کہ وکیل کا حکم ہے یہی قول صحیح ہے، ہاں ارتداد کے زمانہ کے اس کے فیصلے معتبر نہ ہوں گے)[1]

(۶) موکل کے خود تصرف کرنے سے وکیل معزول ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی مقدمہ میں سلطان خود فیصلہ کرے تو اس مقدمہ کے حق میں قاضی معزول شمار ہوگا۔[2]

لیکن ایک چیز میں دونوں (یعنی وکیل اور قاضی) مختلف ہیں وہ کہ موکل جب مرجائے یا اس پر روک (بین) لگ جائے جیسے وہ عبد ماذون تھا پھر محجور قرار دیا گیا تو اس کا وکیل معزول ہو جاتا ہے؛ لیکن سلطان وخلیفہ کا جب انتقال ہو یا منصب سے علاحدہ ہو جائے یا علاحدہ کر دیا جائے تو اس کے قضاۃ اور ولاۃ معزول نہیں ہوتے ہیں۔[3]

۴۸۶- **ضابطہ:** کسی محدود حلقے کے قاضی کی وفات سے اس کے مقرر کردہ نائبین اپنے عہدوں سے معزول ہو جائیں گے، جبکہ امیر المؤمنین اور قاضی القضاۃ کی موت سے ان کے متعین کردہ نائبین معزول نہ ہوں گے۔[4]

---

(۱) وفی الولوالجیۃ: اذا ارتد القاضی و فسق ثم صلح فھو علی حالہ لأن المرتد أمرہ موقوف و لأن الارتداد فسق و بنفس الفسق لا ینعزل الا أن ما قضی فی حالۃ الردۃ باطل...وفی الواقعات الحسامیۃ الفتوی علی أنہ لا ینعزل بالردۃ الخ۔ (البحر الرائق: ۶/ ۲۸۳، شاملہ)

(۲) (مستفاد بدائع: کتاب الوکالۃ، باب ما یخرج بہ الوکیل عن الوکالۃ)

(۳) لا یختلفان الا فی شی واحد: وھو أن الموکل اذا مات او خلع ینعزل الوکیل والخلیفۃ اذا مات أو خلع لا تنعزل قضاتہ و ولاتہ۔ (بدائع الصنائع: ۷/ ۱۶، شاملہ)

(۴) (قاموس الفقہ: بحوالہ: معین الاحکام ۴۷)

کتاب القاضی الی القاضی

یعنی

مقدمہ کی ترسیل کا بیان

۴۸۷-**ضابطہ**: ایک قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف ان مقدمات میں جو شبہ سے ساقط نہیں ہوتے حجت ہے۔ اور جو مقدمات شبہ سے ساقط ہوجاتے ہیں (اور وہ حدود وقصاص ہیں) ان میں معتبر نہیں۔ (۱)

تشریح: خط بھیجنے سے مراد: ایک حلقہ کے قاضی کا دوسرے حلقے کے قاضی کی طرف مقدمات کی کاراوئی کی ترسیل کرنا ہے، یہ اپنے قیاس کے لحاظ سے جائز نہیں ہے کیونکہ جب خود قاضی کی خبر دوسرے حلقہ کے قاضی کے لئے حجت نہیں ہے تو اس کا خط بدرجہ اولی حجت نہیں ہونا چاہئے لیکن متاخرین فقہاء نے حاجت کی بنا پر چند شرائط کے ساتھ استحساناً اس کو جائز قرار دیا ہے۔ (۲) مگر حدود وقصاص میں اس ترسیل کو معتبر نہیں مانا ہے کیونکہ حدود وقصاص شبہ سے ساقط ہوجاتے ہیں اور اس خط کی ترسیل میں ایک گونہ شبہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ حدود وقصاص میں اصل امکانی حد تک ان کو ساقط کرنا ہوتا ہے اور خطِ قاضی قبول کرنے میں ان کو ثابت کرنا لازم آتا ہے؛ حدود وقصاص

(۱) كتاب القاضى على القاضى حجة فى الأحكام (قواعد الفقہ ص: ۱۰۰، قاعدہ: ۲۲۱) ويقبل كتاب القاضى الى القاضى فى الحقوق اى التى تثبت مع الشبهات بخلاف الحدود والقصاص۔ (فتح القدير: ۲۸۶/۷ - معين: ۱۳۰/۱ - تحفة الفقهاء: ۳۷۱/۳) (۲) (فتح القدیر: ۲۸۶/۷ شاملہ)

کے علاوہ باقی تمام مقدمات میں خواہ وہ منقول اشیاء سے متعلق ہوں یا غیر منقول اشیاء سے اور خواہ اعیان سے تعلق رکھتے ہوں یا دیون سے قاضی کا خط حجت ہے یہ امام محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے اور اسی پر متاخرین ہیں اور ضرورت کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔[1]

لیکن فقہاء نے از راہ احتیاط کتاب القاضی میں یہ شرطیں لگائی ہیں کہ قاضی خط کا مضمون عنوان اور تاریخ درج کر کے کم از کم دو گواہوں کے سامنے پڑھ کر سنائے اور ان کے سامنے ہی مہر لگائے پھر اس مہر شدہ تحریر کو ان گواہوں کے ساتھ مکتوب الیہ قاضی کے پاس بھیجے، جب یہ گواہ وہاں پہنچے تو مکتوب الیہ قاضی مہر کو ملاحظہ کرے اور گواہوں سے دریافت کرے کہ یہ تحریر کس کی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے، اگر وہ پورے طور پر شہادت دیں کہ فلاں قاضی نے یہ تحریر ہمارے سامنے لکھی ہے اور اس میں یہ مضمون ہے تو پھر خصم (فریق مخالف) کو طلب کرے اور اس فریق اور گواہان کے سامنے یہ تحریر پڑھے اور گواہان اس کی تصدیق کریں اب جا کر اس تحریر کا اعتبار کیا جائے گا اور قاضی مقدمہ کی کاروائی کرے گا۔[2]

البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک خط کے مضمون کا گواہوں کے سامنے پڑھنا ضروری نہیں، نیز مہر لگانا بھی شرط نہیں، بس صرف اتنا کافی ہے کہ شاہدین خط لے جا کر یہ شہادت دیں کہ یہ تحریر فلاں قاضی صاحب نے لکھی ہے اور انہوں نے آپ

---

(۱) ولا یقبل کتاب القاضی الی القاضی فی الحدود و القصاص لأن فیه شبه البدلية عن الشهادة فصار كالشهادة و لأن مبناها على الاسقاط وفي قبوله سعي في اثباتها (اللباب: ۴/۸۷، شاملة) قوله (كل حق) من نكاح و طلاق و قتل موجبه مال وأعيان ولو منقولة وهو المروي عن محمد و عليه المتأخرون، وبه يفتى للضرورة (شامی: ۵/۴۳۲، شاملہ)

(۲) (مستفاد: الدر المختار: ۵/۴۳۴- فتح القدیر: ۷/۲۹۱-۲۹۵ شاملہ)

کے پاس ہم کو لے کر بھیجا ہے، شمس الائمہ سرخسیؒ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ مسئلہ قضاء سے متعلق ہے، علامہ ابن الہمامؒ نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے اور لکھا ہے کہ اگر یہ خط گواہوں کے ساتھ بھیجا جاتا ہے تو ان کے سامنے پڑھنا اور مہر لگانا ضروری نہیں کیونکہ اس میں مقصود شاہدوں کی عدالت کے ساتھ یہ بات پہنچنا ہے کہ یہ خط فلاں قاضی کا ہے پس اس شہادت کے ہوتے ہوئے خط کا غیر مختوم ہونا وغیرہ مضر نہ ہوگا، لیکن اگر قاضی خط کو مدعی کے ساتھ بھیجتا ہے تو اس میں مہر لگانا شرط ہوگا کیونکہ اس میں تغییر کا احتمال ہے مگر یہ کہ گواہ اس میں موجود مضمون کو محفوظ کرلیں اور گواہی دیں کہ یہ وہی مضمون ہے جو اس کو سپرد کیا گیا تھا تو پھر اس وقت بھی مہر لگانا شرط نہ ہوگا۔ (۱)

فائدہ: کیا آج کے زمانہ میں ڈاک، تار، فیکس وغیرہ کے ذریعہ مقدمہ کی ترسیل معتبر ہوگی یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں مفتیان کرام کے درمیان اختلاف ہے، قاضی مجاہد الاسلام صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اسلامی عدالت'' میں ایک مفصل اور چشم کشا حاشیہ تحریر کیا ہے جو قابل ملاحظہ ہے، اس کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''بہر حال حسن بصری، سوار بن عبداللہ، عبیداللہ بن حسن عنبری، امام ابو ثور، اسحاق

---

(۱) (وقال ابو يوسف رحمه الله آخرا: شي من ذلك ليس بشرط فالشرط أن يشهدهم أن هذا كتابه وختمه) بعدما كان أو لا يقول كقول أبي حنيفة وعن أبي يوسف ايضا أن الختم ليس بشرط إنما رخص في ذلك لما ابتلي بالقضا وليس الخبر المعاينة وهذا اختيار شمس الأئمة السرخسي، ولاشك عندى في صحته فان الفرض اذا كان عدالة الشهو دوهم حملة الكتاب فلايضره كونه غير مختوم مع شهادتهم انه كتابه، نعم اذا كان الكتاب مع المدعى ينبغي أن يشترط الختم لاحتمال التغيير الا أن يشهدوا بما فيه حفظا۔ الخ (فتح القدير: ۷/ ۲۹۲۔ ۲۹۳)

بن راہویہ، ابوعبید القاسم بن سلام، ابوسعید الاصطخری، امام مالک (ایک روایت کے مطابق) اور امام احمد بن حنبل (ایک روایت کے مطابق) کتاب القاضی کی قبولیت کے لئے شہادت کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ خط اور مہر کی شناخت کو کافی سمجھتے ہیں۔ عام طور پر جو ائمہ کا مسلک ہے اس پر عمل دشوار ہے بلکہ ان شرائط کی پابندی میں حق ضائع ہونے اور عام مقدمات میں حصول انصاف کے ناممکن ہو جانے کا یقین ہے"۔

اخیر میں تحریر فرماتے ہیں: "ہمارے یہاں دارالقضاء میں یہ معمول ہے کہ عام طور پر ایک قاضی دوسرے قاضی کو جب مسل ارسال کرتا ہے تو اس پر دارالقضاء کی مہر لگاتا ہے، اپنے دستخط کرتا ہے اور رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعہ ارسال کرتا ہے، عام طور پر دستی فریق کے معرفت بھیجنے کا رواج نہیں۔ بعض غیر اہم معاملات میں جہاں کوئی فوری ضرورت درپیش ہو کسی معتبر شخص کے معرفت اور کبھی کسی فریق کے معرفت سربمہر لفافہ بھیجا جاتا ہے اور ایسا بہت شاذ ہے۔ برسہا برس کے تجربہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ طریقہ کار قابل اطمینان ہے، اور حصول انصاف کو سہل بنانے والا ہے، اسی لئے ہم نے "متن کتاب" میں ائمہ اربعہ کے مسلک سے ہٹ کر مالکیہ اور حنابلہ کی ایک روایت اور حسن بصری، سوار، عنبری، ابوثور، اور امام شعبی وغیرہ کی رائے کو اختیار کیا ہے"۔[1]

یہی مضمون حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم کے مخصوص دمقبول انداز میں ملاحظہ فرمائیں جو مذکور کتاب ہی کے حوالہ سے منقول ہے:

"آج کی دنیا میں تعلقات اور معاملات کے دائرے بہت وسیع ہو گئے ہیں، بعض اوقات فریقین کا تعلق دو الگ الگ ملکوں سے ہوتا ہے، یا ایک ہی ملک کے دو ایسے شہروں سے ہوتا ہے جو طویل مسافت پر واقع ہوتے ہیں، ایسی صورت میں اگر مقدمہ کی کاروائی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے دو آدمیوں کو بھیجنا پڑے تو اتنا کثیر صرفہ آئے گا کہ انصاف کا حصول محض آرزو بن کر رہ جائے گا، دوسری طرف

(۱) (اسلامی عدالت، ص: ۴۲۳ تا ۴۲۴)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں ڈاک کا ایسا نظم قائم ہو گیا ہے جو بہ مقابلہ قدیم زمانہ کے کافی ترقی یافتہ بھی ہے اور محفوظ و قابل اطمینان بھی، فقہاء کا مقصود اصل میں صرف اتنا ہے کہ مکتوب الیہ کو اس بات کا اطمینان حاصل ہو جائے کہ جس شخص کی طرف تحریر کی نسبت کی گئی ہے فی الواقع یہ اس کی تحریر ہے، آج کل رجسٹری اور انشورنس کے ذریعہ محفوظ طریقہ پر ڈاک کا جو نظم قائم کیا گیا ہے وہ مناسب حد تک قابل اطمینان ہے اور اس پر تجربات اور آئے دن کے واقعات شاہد ہیں، اگر کوئی معاملہ مشکوک نظر آئے تو دوبارہ مراسلت یا فون کے ذریعہ اس کی تحقیق بھی ممکن ہے، اس لئے موجودہ حالات میں ان ذرائع سے مقدمات کی کاروائی بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ (۱)

تحکیم (ثالثی) کا بیان

تمہید: فریقین کا اپنے باہمی نزاع کے حل کے لئے کسی فرد یا جماعت کو ثالث مقرر کرنا اور اس کے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار کرنا تحکیم کہلاتا ہیں، اور جس کو ثالث مقرر کیا اس کو "حَکَم" کہا جاتا ہے، اس سلسلہ میں چند ضوابط ملاحظہ فرمائیں۔

۴۸۸- **ضابطہ**: ہر وہ شخص جس کی شہادت اس نوع کے مقدمہ میں قبول کی جاتی ہو اس کو حکم بنانا جائز ہے اور جس کی قبول نہ کی جاتی ہو اس کو حکم بنانا جائز نہیں۔ (۲)

تشریح: حکم (ثالث) کی حیثیت چونکہ قاضی کی ہوتی ہے اس لئے اس کے تقرر میں وہی اہلیت ضروری ہوگی جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہے اور کتاب القضاء کی ابتداء میں گزر چکا ہے کہ قاضی میں اہلیت شہادت ضروری ہے پس حکم بھی اسی کو مقرر کیا جا سکتا ہے جو مقدمہ میں شاہد بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (۳)

(۱) (قاموس الفقہ: ۴/ ۵۲۲) (۲) کل من تقبل شہادتہ فی امر جاز أن یکون حکمافیہ و من لا فلا (معین الحکام: ۲۷)

(۳) وشرطہ من جہۃ المحکم بالفتح صلاحیتہ للقضاء (الدر المختار علی ھامش رد المحتار: ۸/ ۱۲۶ اللباب فی شرح الکتاب: ۴/ ۸۸، شاملۃ)

پس نابالغ بچہ، غلام، مجنون، اندھا، گونگا، کافر اور محدود فی القذف کو حکم بنانا جائز نہیں کیونکہ ان میں اہلیت شہادت نہیں ہے۔ اور فاسق کو حکم بنانا جائز ہے کیونکہ اس میں اہلیت شہادت موجود ہے۔ (تفصیل کتاب القضاء میں ضابطہ: ۴۷۴ رمیں ملاحظہ فرمائیں)

۴۸۹-ضابطہ: تحکیم کو کسی شرط پر معلق کرنا یا زمانہ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، برخلاف قضاء کے۔[1]

جیسے اگر کہا فلاں شخص آجائے اس کے بعد تم حکم ہو، یا فلاں وقت کے بعد حکم ہو تو یہ جائز نہیں ایسی تحکیم کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ برخلاف قضاء کے کہ اس میں تعلیق وتقیید درست ہے جیسا کہ گزر چکا۔

۴۹۰-ضابطہ: تحکیم حقوق العباد میں جائز ہے، حقوق اللہ میں جائز نہیں۔

تشریح: اصل یہ ہے کہ تحکیم تفویض ہے پس جن امور میں فریقین خود اختیار رکھتے ہیں یعنی خود انجام دینے کے اہل ہیں ان میں وہ کسی کو حکم بنا سکتے ہیں اور جو امور فریقین کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں ان میں وہ کسی کو حکم نہیں بنا سکتے ہیں اول امور کا تعلق حقوق العباد سے ہیں اور ثانی کا تعلق حقوق اللہ سے ہیں پس مالی نزاعات، طلاق، عتاق، نکاح مال مسروقہ کے ضمان میں حکم (ثالث) مقرر کرنا جائز ہے۔ اور حد زنا، حد سرقہ، حد قذف اور دیت میں کسی کو حکم بنانا جائز نہیں۔[2]

---

(۱) قال ابو یوسف: لایجوز تعلیقه بالشرط و اضافته الی وقت، بخلاف القضاء لکونه صلحاًمن وجه، بحر۔ (شامی: ۱۲۵/۸) و لایصح التحکیم معلقا بالخطب ولامضافاالی المستقبل (معین الحکام: ۲۷)

(۲) یصح التملیک فی مایملکان فعل ذالک بانفسهما هو حقوق العباد ولایصح فی مالایملکان وهو حقوق ال اللہ تعالی حتی یجوز التحکیم فی الأموال والطلاق والعتاق والنکاح والقصاص وتضمین السرقة ولایجوز ←

اور قصاص کے متعلق صحیح یہ ہے کہ اس میں تحکیم درست نہیں یہ امام خصاف رازیؒ کا قول ہے اور شامی میں اسی کو صحیح کہا ہے اور محیط کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ قصاص میں حق اللہ بھی ہے۔ (۱)

۴۹۱- **ضابطہ:** حکم کا فیصلہ ہر اس شخص کے حق میں معتبر نہیں جس کے حق میں اس کی شہادت معتبر نہیں جیسا کہ قضاء قاضی کا حکم ہے۔

تشریح: پس حکم کا فیصلہ اپنے اصول، فروع، بیوی، تجارتی شریک وغیرہ ان تمام کے حق میں جن کی شہادت شرعاً معتبر نہیں صحیح نہ ہوگا، البتہ ان کے خلاف میں فیصلہ درست ہوگا جیسا کہ شہادت اور قضاء قاضی کا حکم ہے۔

اور بھائی بہن وغیرہ کے حق میں حکم کا فیصلہ درست ہے کیونکہ ان کے حق شہادت معتبر ہے۔ (۲)

نوٹ: شہادت کن کے حق میں معتبر نہیں اس سلسلہ میں تفصیل کتاب الشہادت

← فی حد الزنا والسرقة والقذف لأن التحکیم تفویض والتفویض یصح فی مایملک المفوض فیه بنفسه ولایصح فی مالایملک (معین الحکام: ۲۷-۲۸) (صح لوغیر حد وقود ودیة علی عاقلة) الاصل آن حکم المحکم بمنزلة الصلح (الدر المختار علی هامش ردالمحتار: ۱۲۷/۸- اللباب فی شرح الکتاب: ۸۹/۳)

---

(۱) وماذکره من منعه فی القصاص تبعاً للکنز وغیره هو قول الخصاف وهو الصحیح کما فی الفتح، وماذکره فی المحیط من جوازه فیه لأنه من حقوق العباد ضعیف روایة ودرایة لأن فیه حق الله تعالیٰ ایضاً۔ (شامی: ۱۲۷/۸)

(۲) وحکم الحاکم لأبویه وزوجته وولده باطل والمولی والمحکم فیه سواء وهذا لأنه لا تقبل شهادته لهؤلاء لمکان التهمة فکذلک لا یصح القضاء لهم، بخلاف ما اذا حکم علیهم لأنه تقبل شهادته علیهم لانتفاء التهمة فکذا القضاء (هدایه: ۱۰۸/۳، شاملہ)

میں ضابطہ:۴۳۹ رملاحظہ فرمائیں۔

۴۹۲- **ضابطہ**: حکم کا ایسا فیصلہ جس میں کسی نابالغ کو ضرر پہنچتا ہو صحیح نہ ہوگا، برخلاف قضاء قاضی کے وہ درست ہے۔[1]

تفریع: پس اگر حکم نے نابالغ کے وصی کے خلاف کوئی ایسا فیصلہ کیا جس میں نابالغ کا نقصان ہے مثلاً نابالغ کی زمین کم قیمت بیچنے کا فیصلہ کیا یا زیادہ قیمت میں اس کے لئے کسی چیز کے خریدنے کا فیصلہ کیا تو ایسا فیصلہ درست نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر حکم نے نابالغ کا نکاح فسخ کردیا تو یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا، جبکہ قاضی کے یہ تمام فیصلے درست ہوں گے۔[2]

۴۹۳- **ضابطہ**: فیصلہ سے پہلے فریقین میں سے ہر ایک کو تحکیم سے رجوع جائز ہے؛ فیصلہ کے بعد رجوع کا اختیار نہیں۔[3]

تشریح: پس جب تک فیصلہ نہ ہوا ہو فریقین میں سے ہر ایک کو تحکیم سے رجوع کا اختیار ہوتا ہے یعنی اگر چاہے تو حکم کو معزول کر سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ کے بعد دونوں فریق کو وہ فیصلہ تسلیم کرنا لازم ہوگا حکم کو معزول کر کے اس کے فیصلہ کو باطل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس فیصلہ کا صدور ان پر ولایت شرعیہ سے ہوا ہے۔[4]

۴۹۴- **ضابطہ**: حکم کا فریقین سے فیصلہ پر اجرت لینا جائز ہے، ہدیہ لینا جائز نہیں۔

---

(۱) لایصح حکمه بما فیه ضرر علی الصغیر بخلاف القاضی (شامی: ۸ر۱۲۹)

(۲) (شامی: ۸ر۱۲۹ ازکریا، البحر الرائق: ۷ر۱۶، شاملہ)

(۳) ولکل واحد من الحکمین أن یرجع ما لم یحکم علیهما، فاذا حکم لزمهما (اللباب فی شرح الکتاب: ۴ر۸۹، شاملة)

(۴) ولا یبطل حکمه بعزلهما عن ولایة شرعیة۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۸ر۱۲۹)

تشریح: حکم چونکہ مثل قاضی کے ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر قاضی کو بیت المال سے کچھ نہ ملتا ہو تو اس کو اجرت مثل کے بقدر لینا جائز ہے تو حکم (ثالث) کا بھی یہی حکم ہوگا۔ اور قاضی کے لئے ہدیہ لینا جائز نہیں کیونکہ ہدیہ اس کے لئے رشوت ہے تو حکم کے لئے بھی ہدیہ لینا جائز نہ ہوگا۔ (۱)

۴۹۵- **ضابطہ**: حکم کے لئے دوسرے شخص کو حکم بنانا درست نہیں، مگر فریقین کی اجازت سے درست ہے۔ (۲)

۴۹۶- **ضابطہ**: کسی واقعہ میں ایک سے زیادہ حکم ہوں تو فیصلہ میں سب حکموں کا اتفاق ضروری ہے۔ (۳)

تفریع: پس اگر مرد نے عورت کو کہا تو مجھ پر حرام ہے اور اس سے تین طلاق سے کم طلاق کی نیت کی، پھر میاں بیوی نے دو شخصوں کو حکم بنایا تو ان میں سے ایک حکم نے ایک طلاق بائن کا فیصلہ کیا اور دوسرے نے تین طلاق کا فیصلہ کیا تو کسی کا فیصلہ درست نہ ہوگا کیونکہ ایک بات پر دونوں نے اتفاق نہیں کیا ہے جبکہ اتفاق ضروری تھا (اب یہ فیصلہ دوسرے حکم یا قاضی پر موقوف ہوگا) (۴)

---

(۱) (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم: ۱۵/ ۹۹- ۱۰۰- شامی: ۸/ ۱۳۱، مطلب فی هدیة القاضی- ۸/ ۱۳۱، آخر باب التحکیم)

(۲) ولیس للمحکم تفویض التحکیم الی غیره (الدر المختار) وفی الشامیة: فلو فوض وحکم الثانی بلا رضاهما فأجازه القاضی لم یجز الا أن یجیزهما۔ الخ (شامی: ۱۳۰ وهکذا فی فتاویٰ دار العلوم: ۱۵/ ۱۰۷)

(۳) حکما رجلین فلابد اجتماعهما علی المحکوم به (الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۸/- ۱۲۹ العنایة شرح الهدایة: ۷/ ۳۲۰)

(۴) فلو حکم احدهما و اختلفا لم یجز کما فی البحر عن الو لو الجیه و فیه عن الخصاف لو قال لامرته انت علی حرام، ونو الطلاق دون الثلاث فحکما ←

۴۹۷- **ضابطہ:** حکم کا فیصلہ قاضی کے پاس گیا تو وہ فیصلہ قوانین شرعیہ کے موافق ہوگا تو قاضی اس کو جاری رکھے گا ورنہ رد کردے گا۔ (۱)

کتاب الصلح

۴۹۸- **ضابطہ:** مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے سوائے اس صلح کے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے والی ہے۔

تشریح: یہ حدیث شریف ہے جو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے والی صلح کے علاوہ ہر صلح کی مشروعیت کو بتلایا گیا ہے۔ (۲)

صلح کی مشروعیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہے: "فاصلحوا بینهما" (۳) تم ان کے درمیان صلح کرادو، اور ایک موقع پر فرمایا "والصلح خیر" (۴) اور صلح بہتر ہے۔ پس فریقین کو صلح کی طرف پھیرنا ان کو خیر کی طرف پھیرنا ہے، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قاضی وغیرہ کے لئے بہتر یہ ہے کہ فریقین میں صلح کروانے کی کوشش کرے، اس سلسلہ میں سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد قابل ذکر ہے کہ:

رجلین، فحکم أحدهما بأنها بائن وحکم الآخر بأنها بائن بالثلاث لم یجز لأنهما لم یجتمعا علی أمر واحد (شامی: ۸/۱۲۹)

(۱) اذا عرض حکم المحکم علی القاضی المنصوب من قبل السلطان فاذا کان موافقا للأصول صدقه والا نقضه۔ (شرح المجلة: ۱/۳۷۶)

(۲) (کل صلح جائز فیما بین المسلمین الا صلحا أحل حراما أو حرم حلالا۔ المغنی: ۴/۳۰۸، ترمذی حدیث: ۱۳۵۲ باب ماذکر عن رسول اللہ)

(۳) (النساء: ۱۲۸)

(۴) (الحجرات: ۹)

مخاصمین کو واپس لوٹاؤ یہاں تک کہ وہ صلح کر لیں کیونکہ فیصلہ آپس میں کینہ وکدورت پیدا کرتا ہے۔[1]

فائدہ: فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ چند صورتیں بیان کی ہیں جن میں قاضی کے لئے حکم ہے کہ حق کے انکشاف کے باوجود فریقین میں صلح کی تاکید کرے:

۱- جبکہ اس کا اندیشہ ہو کہ فیصلہ کی صورت میں فریقین میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھے گی، اور جھگڑا ختم ہونے کی بجائے طول پکڑ لے گا۔

۲- فریقین اہل فضل وکمال ہوں کہ فیصلہ کی صورت میں رازہائے سربستہ کے منکشف ہونے اور ہتک عزت کا اندیشہ ہو۔

۳- فریقین باہم قریبی رشتہ دار ہوں کہ ایسی صورت میں باہمی مفاہمت کے ذریعہ جو کچھ طے ہوگا وہ فریقین کے باہمی تعلقات کو قائم رکھنے میں مدد دے گا۔

۴- فریقین کے دلائل اور دونوں کے ثبوت بقوت وضعف کے اعتبار سے قریب قریب برابر ہوں (یہ علاحدہ بات ہے کہ ایک فریق کا طرز تعبیر دوسرے کے مقابلہ میں بلیغ تر ہو)

۵- دعوے کا تعلق ایسے امور یا واقعات سے ہو جن کے نقوش قدامت وکہنگی کی وجہ سے مٹ چکے ہوں اور اس وجہ سے ایسا اشتباہ پیدا ہو گیا ہو کہ کسی یقینی نتیجہ تک پہنچنا دشوار ہو۔

البتہ صلح میں ایک فریق کا ظلم اور دوسرے کی مظلومیت بالکل واضح ہو تو اس وقت قاضی قطعی فیصلہ کا پابند ہے، صلح نہیں کرے گا۔[2]

---

(۱) قال عمر: ردوا الخصوم حتی یصطلحوا فان فصل القضاء یورث بین القوم الضغائن (مصنف ابن أبی شیبة: ۵۳۴/۴)

(۲) (یہ فائدہ کا مضمون معمولی فرق کے ساتھ حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قدس سرہ کی کتاب: اسلامی عدالت: ۳۰۳-۳۰۵ سے بحوالہ معین الحکام ماخوذ ہے)

۴۹۹- ضابطہ: حقوق اللہ میں صلح جائز نہیں۔ (۱)

تشریح: پس زنا، تہمت زنا، چوری، شراب وغیرہ کی حدود میں -جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے- صلح کا اعتبار نہ ہوگا، مثلاً کسی شخص نے زانی یا شرابی یا دوسرے کا مال چوری کرنے والے کو پکڑا پھر اس مجرم سے کوئی مال لے کر صلح کر لی اس شرط پر کہ وہ حاکم کے پاس نہیں لے جائے گا تو یہ صلح صحیح نہیں یہ مال لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ سب حقوق اللہ میں سے ہیں اور حقوق اللہ میں صلح درست نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ صلح کرنے والا صلح کے ذریعہ اپنی ذات کے حق میں تو تصرف کر سکتا ہے اس طرح کہ اپنے حق کی وصولی کے لئے کچھ معاوضہ دیدیا یا کچھ حق ساقط کر دیا وغیرہ لیکن غیر کے حق میں تصرف کا اختیار اس کو نہیں ہے، اور مذکور صورتوں میں غیر کے حق میں تصرف کرنا لازم آتا ہے۔

حد قذف کا بھی یہی حکم ہے چنانچہ اگر کسی نے کسی شخص پر تہمت لگائی پھر اس سے صلح کی کہ اتنا مال دیتا ہوں مجھے معاف کر دے تو یہ صلح صحیح نہیں کیونکہ اگرچہ اس میں بندے کا حق ہے لیکن غالب اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اعتبار غالب کا ہوتا ہے، برخلاف تعزیرات کے یعنی جن جرائم میں حد کی بجائے تعزیر ثابت ہوتی ہے تو ان میں صلح درست ہے کیونکہ تعزیر بندے کا حق ہے اور برخلاف قصاص کے کیونکہ قصاص بھی بندے کا حق ہے خواہ قصاص بالنفس ہو یا قصاص بالمال۔ (۲)

---

(۱) ولا یجوز الصلح عن حقوقه تعالی (درر الحکام شرح غرر الأحکام : ۲/ ۳۹۶، مکتبہ شاملة)

(۲) لا یجوز ان یکون المصالح عنه حقا الله سواء کان مالا عینا و دینا و حقا لیس بمال حتی لا یصح الصلح عن حد الزنا و السرقة و شرب الخمر بأن أخذ زانیا أو سارقا من غیره أو شارب خمر فصالحه علی مال علی أن لا یرفعه الی ولی الأمر لأنه حق الله و لا یجوز الصلح عن حقوقه تعالی لأن المصالح بالصلح ←

۵۰۰۔ ضابطہ: صلح عن اقرار فریقین کے حق میں بیع متصور ہوگی جبکہ صلح عن انکار اور صلح عن سکوت صرف مدعی کے حق کے میں بیع ہوگی۔ (۱)

تشریح: صلح کی بنیادی تین قسمیں ہیں: صلح عن اقرار، صلح عن انکار اور صلح عن سکوت ــــــ صلح عن اقرار یہ ہے کہ مدعی علیہ کو مدعی کے دعویٰ کا اقرار ہو یعنی وہ اس کے دعویٰ کو صحیح تسلیم کرتا ہو اس کے باوجود مدعی کو مطلوبہ چیز دینے کی بجائے کوئی عوض دے کر اس سے صلح کر لے تا کہ مدعی عوض لے کر دعوے دستبردار ہو جائے۔ صلح عن انکار یہ ہے کہ مدعی علیہ کو مدعی کے دعویٰ سے انکار ہو اس کے باوجود وہ یمین سے چھٹکارے اور قطع نزاع کے لئے مدعی کو کچھ دے کر صلح کر لے۔ اور صلح عن سکوت کا مطلب یہ ہے مدعی کے دعوی پر مدعی علیہ خاموش ہو نہ کھل کر اقرار کرتا ہو اور نہ انکار کرتا ہو پھر بھی مدعی کو کوئی چیز دے کر اس سے صلح کر لے۔ صلح کی ان تین قسموں میں صلح عن اقرار بالاتفاق جائز ہے، جبکہ صلح عن انکار و صلح عن سکوت ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک جائز ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں۔ (۲)

اس تمہید کے بعد اب ضابطہ کی تشریح یہ ہے کہ صلح عن اقرار میں اگر عوض میں کسی چیز کا دینا طے ہوا ہے تو چونکہ یہ مبادلۃ المال بالمال ہے اس لئے یہ صلح فریقین کے حق

← یتصرف فی حق نفسہ اما باستیفاء کل حقہ أو استیفاء بعضہ و اسقاط الباقی او بالمعاوضۃ و کل ذلک لا یجوز فی غیر حقہ و کذا اذا صالح عن حد القذف بأن قذف رجلا فصالحہ علی مال علی ان یعفو عنہ لأنہ و ان کان للعبد فیہ حق فالغالب حق اللہ تعالی و المغلوب ملحق بالمعدوم شرعا بخلاف التعزیر حیث یصلح الصلح عنہ لأنہ حق العبد و القصاص فی النفس و ما دونھا لأنہ أیضا حق العبد۔ (درر الحکام شرح غرر الأحکام: ۲/۲۹۶، مکتبہ شاملۃ)

(۱) (مستفاد: ہدایہ: ۳/۱۹۰ — تاتارخانیہ: ۱۴/۲۲۸)

(۲) (المغنی: ۴/۳۰۸ — تحفۃ الفقہاء ۳/۲۹۵، شاملۃ)

میں بیع متصور ہوگی اور اس میں دونوں کے حق میں بیع کے جملہ احکام خیار رویت، خیار عیب، حق شفعہ وغیرہ جاری ہوں گے۔ جبکہ صلح عن انکار و صلح عن سکوت چونکہ مدعی علیہ کے اقرار سے نہیں ہوتی ہے بلکہ انکار یا سکوت کے باوجود صرف یمین سے چھٹکارے یا قطع نزاع کے لئے مدعی سے وہ صلح کر لیتا ہے اس لئے یہ دونوں صلح صرف مدعی کے حق میں بیع ہوگی مدعی علیہ کے حق میں بیع نہ ہوگی۔

چنانچہ ان دو صلح (صلح عن انکار، صلح عن سکوت) میں عیب کی بنا پر واپس کرنے کا حق صرف مدعی کو ہوگا اسی طرح حق شفع صرف اس مکان میں حاصل ہوگا جو بدل صلح میں مدعی کو دیا گیا ہے، مدعی علیہ کے قبضہ میں جو مکان ہے یعنی جس مکان پر صلح ہوئی ہے اس میں حق شفعہ ثابت نہ ہوگا کیونکہ وہ تو درحقیقت مدعی علیہ ہی کا ہے اس نے اپنا دعویٰ اس سے ساقط نہیں کیا ہے۔ برخلاف صلح عن اقرار کے کہ اس میں عیب کی وجہ سے واپس کرنے کا حق مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو ہوگا اور حق شفعہ دونوں ہی مکان میں حاصل ہوگا اس مکان میں بھی جو بدل صلح میں دیا گیا ہے اور اس مکان میں بھی جس پر صلح کی گئی ہے، کیونکہ صلح عن اقرار فریقین کے حق میں بیع ہے۔[1]

(۱) الأصل في هذا أن ماصلح معاوضة ان كان عن اقرار فهو معاوضة المال بالمال من الجانبين وان كان عن انكار فهو معاوضة المال بالمال في حق المدعي بزعمه (تاتارخانیہ جدید: ۲۲۸/۱۴، مکتبہ زکریا) فان وقع الصلح عن اقرار اعتبر فيه مايعتبر في البياعات ان وقع عن مال بمال لوجود معنى البيع وهو مبادل المال بالمال بتراضيهما في حق المتعاقدين بتراضيهما فتجرى فيه الشفع اذا كان عقارا ويرد بالعيب ويثبت فيه خيار الشرط والرؤية.... الصلح عن السكوت والانكار في حق المدعى عليه لافتداء اليمين وقطع الخصومة وفي حق المدعي لمعنى المعاوضة لما بينا (هدايه: ۱۹۰/۳- اللباب في شرح الكتاب: ۱۶۴/۲)

۵۰۱- **ضابطہ**: صلح کو اس عقد صحیح پر محمول کرنا واجب ہے جو اس سے قریب تر ہو (پھر اس میں اس عقد کے شرائط واحکام جاری ہوں گے)(۱)

جیسے:

۱- مدعی نے کسی عین مثلاً گھر وغیرہ کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ نے کچھ رقم دے کر اس کو دعویٰ سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا تو یہ صلح حکماً بیع ہے، پس اس میں بیع کی شرائط واحکام جاری ہوں گے، مثلاً صلح میں جو چیز مبیع کے حکم میں ہے اس کا معین ومتقوم ہونا؛ اس میں خیار عیب اور خیار رویت کا ثابت ہونا؛ اور مصالح علیہ یا مصالح عنہ گھر یا زمین ہے تو اس میں حق شفع کا ثابت ہونا؛ وغیرہ شرائط واحکام بیع کے جاری ہوں گے۔

۲- مدعی علیہ نے مدعی سے کہا تم اپنے دعویٰ وحق سے دستبردار ہو جاؤ اس کے بدلہ میں ایک سال کے لئے میں اپنا مکان یا گاڑی استعمال کے لئے دوں گا تو یہ صلح عقد اجارہ ہے اس میں اجارہ کی شرائط واحکام جاری ہوں گے، پس اس میں ایجاب وقبول کے ساتھ تاجیل (مدت) بیان کرنا ضروری ہے کہ کتنی مدت تک مدعی اس گھر یا گاڑی سے نفع اٹھائے گا اور اس مدت میں فریقین میں سے کسی کی موت ہو جائے تو صلح باطل ہو جائے گی جیسا کہ اجارہ کا حکم ہے۔

۳- مدعی علیہ نے مدعی سے کہا میں آپ کی یہ مطلوبہ چیز مثلاً گھر یا گاڑی کو واپس کر دوں گا مگر فی الحال نہیں بلکہ ایک سال کے بعد دوں گا تب تک اس سے نفع اٹھانے کا مجھے موقع دیا جائے تو یہ صلح عاریت کے معنی میں ہوگی اور اس میں عاریت کی شرائط واحکام جاری ہوں گے، چنانچہ مدعی جب چاہے اپنے گھر یا گاڑی کا مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ عاریت غیر لازم معاملات میں سے ہے اور وہ چیز مدعی علیہ کے قبضہ میں بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہ آئے گا جیسا کہ سامان عاریت کا حکم ہے۔

---

(۱) یجب حمل الصلح علی العقد الذی یکون قریبا منہ، ویجب وجود شروط ذلک العقد (درر الحکام فی شرح المجلۃ: ۱۰/ ۳۸۷)

۴- مدعی علیہ کے قبضہ میں کوئی چیز تھی مدعی نے اس سے کہا میں اپنی اس چیز کے بعض حصہ سے دستبردار ہو جاتا ہوں بشرطیکہ اس کا باقی حصہ تم ادا کر دو تو وہ حصہ جس سے مدعی دستبردار ہو گیا مدعی علیہ کے لئے ہدیہ ہوگا، پس اس میں ہدیہ کی شرائط واحکام جاری ہوں گے، چنانچہ مدعی علیہ کا قبول کرنا شرط ہے نیز وہ چیز قابل تقسیم ہونا ضروری ہے کیونکہ مشترک چیز کا ہدیہ قابل تقسیم میں درست نہیں۔

۵- مدعی نے کچھ رقم کا دعوی کیا اور مدعی علیہ نے اعتراف کرتے ہوئے اس بات پر صلح کر لی کہ اس کے بدلہ میں ایک مہینے کے بعد گیہوں دیدوں گا تو یہ صلح بیع سلم کے حکم میں ہو گی اور اس میں سلم کی شرائط واحکام جاری ہوں گے (بیع سلم یہ ہے کہ ثمن نقد ہو اور سامان ادھار ہو اور اس صلح میں یہی بات ہے)[1]

پس صلح کو جس عقد پر محمول کرنا ممکن ہوگا اس پر محمول کیا جائے گا اور اس میں اسی عقد کی تمام شرائط واحکام جاری ہوں گے جیسا کہ مثالوں سے واضح ہوا کیونکہ عاقل بالغ کا تصرف حتی الامکان صحت کی طرف پھیرنا واجب ہے۔

اسی وجہ سے ضابطہ میں عقد کے ساتھ "صحیح" کی قید لگائی گئی کیونکہ اگر صلح میں کوئی عقد فاسد بنتا ہو تو اس عقد پر صلح کو محمول نہیں کیا جائے گا، مثلاً مدعی نے دو ہزار روپے کا دعوی کیا، مدعی علیہ نے اقرار کرتے ہوئے کہا: میں ایک مہینے کے بعد ادا کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ فی الحال مجھے پانچ سو روپے نقد ادا کرو، مدعی نے منظور کر لیا اور صلح ہو گئی تو یہ پانچ سو روپے کو دو ہزار کا معاوضہ قرار نہیں دیں گے کیونکہ ایسا کرنے میں عقد ربا (سود) ہو جاتا ہے اور یہ جائز نہیں، بلکہ اس پانچسو کو صرف بدل صلح تصور کریں گے اور عقد کو اس بات پر محمول کریں گے کہ گویا مدعی نے دو ہزار میں سے پندرہ سو وصول کئے اور پانچ سو ساقط کر دئے کیونکہ عاقل بالغ کے تصرف کو حتی الامکان فساد سے بچا کر صحت پر محمول کرنا واجب ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس سلسلہ میں یہ ضابطہ

---

(۱) (هذا التفصيل كله ماخوذ من "الفقه الاسلامي وادلته": ۲۹۷/۵)

بیان کیا ہے کہ: کل شی وقع علیه الصلح وهو مستحق بعقد المداینة لم یحمل علی المعاوضة، وانما یحمل علی انه استوفی بعض حقه وسقط باقیه۔

(هدایه: ۳/۴۳-۱۹۴ مجلة الأحکام: ۱/۳۰۳)

۵۰۲-**ضابطہ**: ہر وہ حق جو قابل معاوضہ نہیں جیسے حق شفعہ، حق خلو (پگڑی) حد قذف وغیرہ ان میں صلح علی بدل جائز نہیں۔ (۱)

تشریح: یعنی شفیع کا مشتری یا مکان مالک سے کوئی معاوضہ لے کر حق شفع سے دست بردار ہو جانا یا کرایہ دار کا حق خلو میں کوئی معاوضہ طلب کر کے صلح صفائی کرنا یا قاذف کا مقذوف کو مال دے کر حاکم یا قاضی کے پاس جانے سے روکنا یہ جائز نہیں، کیونکہ حق شفعہ اور حق خلو اور حد قذف وغیرہ قابل معاوضہ نہیں ہے یعنی ان کا کوئی عوض لینا جائز نہیں۔

البتہ مدعیٰ علیہ یمین سے چھٹکارے اور قطع نزاع کے لئے ان حقوق کے بدلہ میں کچھ مال دے کر صلح کرے تو یہ صحیح ہے یعنی دنیوی احکام میں ختم نزاع کے لئے صحیح ہے لیکن مدعی نے جانتے ہوئے ناحق مال لیا ہے تو وہ آخرت میں مؤاخذہ سے نہیں بچ سکے گا مگر یہ کہ دونوں میں معافی تلافی ہو جائے تو امید ہے مؤاخذہ نہ ہو۔ (۲)

۵۰۳-**ضابطہ**: صلح میں ہر وہ چیز جس میں قبضہ کی حاجت ہوتی ہے اس کا معین ہونا ضروری ہے اور جس میں قبضہ کی حاجت نہیں ہوتی اس کا معین و معلوم ہونا ضروری نہیں۔ (۳)

---

(۱) لایصح لو المصالح عنه مما لایجوز الاعتیاض... کحق شفعة وحد قذف الخ (الدر المختار علی رد المحتار۔ ۸/۴۰۶)

(۲) یصح الصلح باعطاء البدل لاجل الخلاص من الیمین فی دعاوی الحقوق کدعوی حق الشرب والشفعة والمرور۔ (مجلة الأحکام العدلیة: ۱/۳۰۳)

(۳) کل مایحتاج الی قبضه لا بد ان یکون معلوما، لأن جهالته تفضی الی ←

تشریح: معین ومعلوم ہونے سے مراد اس شیء کی مقدار اور وصف کا بیان کرنا ہے کہ میں اس قسم کے وصف کی اتنے وزن یا ناپ کی فلاں چیز دوں گا۔ اگر وصف ومقدار سے اس کی تعیین نہ ہو سکتی ہو جیسے صلح میں کوئی جانور دینا طے ہوا تو صلح کے وقت اس جانور کا سامنے حاضر ہونا ضروری ہے۔

تفریعات:

(۱) پس مجہول کی طرف سے مجہول پر صلح جائز نہیں۔ مثلاً مدعی نے مجہول مکان کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ نے اس کے عوض مجہول مکان دینے پر صلح کی۔

(۲) معلوم کی طرف سے مجہول پر صلح جائز نہیں۔ جیسے مدعی نے معلوم کپڑے وغیرہ کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ اس کے بدلہ مجہول گیہوں وغیرہ پر مصالحت کی۔

کیونکہ ان دونوں میں مصالح علیہ یعنی جس پر صلح کی گئی ہے اس میں مدعی کو قبضہ کی حاجت ہوتی ہے اور وہ مجہول ہے جس کی وجہ سے نزاع کا اندیشہ ہے۔

(۳) اور معلوم کی طرف سے معلوم پر صلح جائز ہے۔ (مثال ووجہ ظاہر ہے)

(۴) اسی طرح مجہول کی طرف سے معلوم پر صلح جائز ہے جیسے نامعلوم مکان، زمین یا گھوڑے وغیرہ کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ نے معلوم ومعین مکان یا زمین یا جانور وغیرہ پر مصالحت کی، کیونکہ اس میں مصالح علیہ معلوم ہے اور مصالح عنہ اگرچہ مجہول ہے مگر اس میں قبضہ کی حاجت نہیں کیونکہ وہ پہلے سے مدعی علیہ کے قبضہ میں موجود ہے پس اس کی جہالت مفضی الی المنازعۃ نہ ہوگی۔ (۱)

← المنازعة وما لا يحتاج الى قبضه يكون اسقاطا فلا يحتاج الى علمه به فانه لا يفضي الى المنازعة (مجمع الانهر: ۲/ ۳۱۱، شاملة)

(۱) الصلح على ربعة أوجه: عن معلوم على معلوم، وعن مجهول على معلوم وهما جائزان۔ وعن مجهول على مجهول، وعن معلوم على مجهول وهما فاسدان۔ (مجمع الانهر: ۲/ ۳۱۱- الجوهرة النيرة: ۱/ ۳۱۸ شاملة)

۵۰۴- **ضابطہ:** صلح جب معاوضہ کے حکم میں ہوتو فریقین کا باہمی رضامندی سے اس کا اقالہ اور فسخ جائز ہے، اور اگر معاوضہ کے معنی میں نہ ہو بلکہ اسقاط کو متضمن ہو تو اس میں فسخ صحیح نہیں۔ (۱)

تشریح: معاوضہ کے حکم میں ہونے سے مراد دونوں طرف عوض کا ہونا ہے، خواہ وہ عوض مال ہو یا منفعت مثلاً مدعی نے گھر کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ نے گاڑی دے کر اس سے مصالحت کرلی؛ یا مدعی نے زمین کا دعویٰ کیا اور مدعی علیہ نے اس کے عوض اپنے گھر میں دس سال تک سکونت پر صلح کی تو یہ دونوں صورتیں معاوضہ کی ہیں ان میں اول بیع اور دوم اجارہ کے حکم میں ہیں، پس ان کو فریقین باہمی رضامندی سے فسخ کر سکتے ہیں، جیسے بیع اور اجارہ کا حکم ہے۔

اور اگر معاوضہ کی صورت نہ ہو جیسے مدعی نے پچیس ہزار روپے کا دعویٰ کیا پھر مدعی علیہ کی ٹال مٹولی پر اس نے اس سے پانچ ہزار معاف کردئے اور بیس ہزار دینے پر مصالحت کرلی تو یہ صلح معاوضہ کے حکم میں نہیں ہے بلکہ اس میں اسقاط کی صورت ہے کہ مدعی نے اپنا بعض حق کو ساقط کیا ہے لہذا اس صلح کو فسخ کرنا مطلقاً صحیح نہیں نہ طرفین کی رضامندی سے نہ ایک جانب سے کیونکہ قاعدہ ہے: "الساقط لا یعود" پس مدعی کے لئے اب ختم صلح کا دعویٰ کر کے پچیس ہزار کا مطالبہ جائز نہیں۔

(۱) اذا کان الصلح فی حکم المعاوضة فللطرفین فسخه واقالته برضائهما واذا لم یکن فی معنی المعاوضة بل کان متضمنا اسقاط بعض الحقوق فلا یصح نقضه وفسخه مطلقا (مجلة الاحکام: ۱/ ۳۰۴-الدر والشامی: ۸/ ۴۱۹، زکریا)

کتاب الإبراء

(بری کرنے کا بیان)

۵۰۵- **ضابطہ**: براءت میں ضروری ہے کہ جن کو بری کیا جارہا ہے معلوم ومتعین ہوں۔

تفریع: پس اگر کہا میں نے اپنے تمام مقروضین کو بری کیا یا کہا کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق نہیں تو یہ براءت صحیح نہیں، اس ابراء کے بعد بھی اگر کسی پر اس کا کوئی حق نکلتا ہو تو وصول کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کہا میں نے فلاں محلہ والوں کو بری کر دیا اور اس محلہ کے افراد معین ومشخص ہیں جن کی گنتی معلوم ہے تو یہ براءت صحیح ہے پس اب اس محلہ کے کسی فرد سے کسی ایسے حق کا مطالبہ جو براءت سے پہلے تھا جائز نہیں۔ [۱]

۵۰۶- **ضابطہ**: براءت قبول پر موقوف نہیں، لیکن رد کرنے سے رد ہو جاتی ہے۔

تشریح: یعنی اگر کسی کو قرض وغیرہ سے بری کیا تو جس کو بری کیا جارہا ہے اس کے قبول پر موقوف نہیں وہ قبول کرے یا نہ کرے براءت صحیح ہو جاتی ہے، البتہ اگر مدیون اسی مجلس میں رد کر دے تو براءت رد ہو جائے گی اور بری کرنے والے کا حق

(۱) یجب أن یکون المبرؤن معلومین ومعینین بناء علیہ لو قال أحد: أبرأت کافۃ مدینی، أو لیس لی عند أحد حق لا یصح ابراؤہ وأما لو قال: أبرأت أھالی المحلۃ الفلانیۃ، وکان أھل تلک المحلۃ معینین وعبارۃ عن أشخاص معدودین فیصح الابراء۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ: ۱/۳۰۶)

بحال رہے گا۔

لیکن اگر قبول کے بعد رد کیا یا مجلس کے بعد رد کیا تو اب یہ رد کرنا صحیح نہ ہوگا اور براءت صحیح رہے گی۔(۱)

۵۰۷- **ضابطہ:** مرض الموت میں وارث کو بری کرنا صحیح نہیں، اجنبی کو بری کرنا صحیح ہے۔(۲)

تشریح: چونکہ وارث کے لئے وصیت صحیح نہیں اور مرض الموت میں کسی کو بری کرنا وصیت کے حکم میں ہے اس لئے وارث کو بری کرنا بھی صحیح نہ ہوگا اور اجنبی کے لئے وصیت صحیح ہے اس لئے اس کو بری کرنا بھی صحیح ہوگا لیکن اجنبی کو بھی صرف تہائی مال کے بقدر ہی بری کرسکتا ہے کیونکہ تہائی سے زیادہ کی وصیت باطل ہے تو براءت کا بھی یہی حکم ہوگا۔

(۱) لا یتوقف الابراء علی القبول ولکن یرتد بالرد فلذالک لو أبرء أحد آخر فلا یشترط قبوله ولکن اذا رد الابراء فی ذلک المجلس بقوله: لا أقبل الابراء یکون ذلک الابراء مردودا، یعنی لا یبقی له حکم۔ لکن لو رده بعد قبول الابراء فلا یرتد الابراء (مجلة الاحکام العدلیة: ۱/ ۳۰۶)

(۲) اذا ابرء احد احد الورثة فی مرض موته من دینه فلا یکون صحیحا ونافذا وأما لو ابرء أجنبیا لم یکن وارثا له من الدین فصحیح ویعتبر من ثلث ماله۔ (مجلة الاحکام العدلیة: ۱/ ۳۰۶)

کتاب المضاربۃ

تمہید: شریعت میں ''مضاربت'': نفع میں شرکت سے متعلق ایک ایسا عقد ہے جس میں ایک شخص کی طرف سے مال اور دوسرے کے ذمہ عمل وانتظام کی شرط ہوتی ہے جس کا مالک ہوتا ہے اس کو ''رب المال'' اور کام وانتظام (مینجمنٹ) کرنے والے کو ''مضارب'' اور مال کو ''راس المال'' اور اردو زبان میں ''سرمایہ'' کہا جاتا ہے۔

یہ عقد ابتداء میں جب تک کہ مضارب راس المال میں تصرف نہ کرے ''عقد ودیعت'' ہے پس اس وقت مضارب کے پاس جو مال ہوگا وہ امانت ہوگا اور اس میں امانت کے احکام جاری ہوں گے؛ اور مال میں تصرف وعمل کے بعد ''عقد توکیل'' ہے پس تصرف کے بعد مضارب کی حیثیت وکیل کی ہوگی اور اس میں وکالت کے احکام جاری ہوں گے؛ اور نفع حاصل ہونے کے بعد یہ عقد ''عقد شرکت'' ہے؛ اور اگر مضارب نے مال میں رب المال کی ہدایت کے خلاف عمل کیا تو یہ غصب ہے اور وہ غاصب شمار ہوگا؛ اور اگر اس معاملہ میں رب المال کے لئے سارے نفع کی شرط لگائی تو یہ ''عقد بضاعۃ'' ہے پس مضارب کی طرف سے ایک تبرع ہوگا؛ اور اگر تمام نفع کی شرط مضارب کے لئے ہو تو یہ ''مقارضہ'' ہے یعنی گویا مضارب نے قرض لے کر اپنا ذاتی کاروبار کیا ہے۔[1]

(۱) المضاربۃ: فی الشرع عقد شرکۃ فی الربح بمال من رجل وعمل من آخر وھی ایداع اولا وتوکیل عند عملہ وشرکۃ ان ربح وغصب ان خالف وبضاعۃ ان شرط کل الربح للمالک ومقارضۃ ان شرط کل الربح للمضارب۔ (التعریفات الفقہیۃ مع قواعد الفقہ: ۲۹۲)

۵۰۸- **ضابطہ**: مضاربت میں سرمایہ کا نقد کرنسی کی شکل میں ہونا ضروری ہے (عروض یعنی سامان خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ کو بطور سرمایہ دینا صحیح نہیں)[1]

تفریع: پس اگر کسی شخص نے ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس بنا کر دوسرے کو دیا کہ اس کو چلاؤ نفع میں ہم دونوں اثلاثا (ایک ثلث ودو ثلث کے حساب سے) شریک رہیں گے تو یہ عقد صحیح نہیں کیونکہ اس میں سرمایا (ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس) عروض میں سے ہے جبکہ سرمایا کا کرنسی کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔ پس اس صورت میں عامل (ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس چلانے والا) اجرت مثل کا مستحق ہوگا اور نفع سارا مالک کا ہوگا۔

لیکن اگر مالک اس کو کرنسی دیتا اور کہتا کہ اس سے ہوٹل یا گیسٹ بنا کر چلاؤ اور ہم دونوں نفع میں شریک رہیں گے تو یہ درست ہوتا۔ اسی طرح اگر ہوٹل بنا کر دیتا اور ساتھ میں مال لانے کے لئے کچھ روپے (کرنسی) بھی دے دیتا اور کہتا کہ اس سے ضروری سامان خرید لو اور یہ ہوٹل چلاؤ اتنے فیصد تمہارا نفع تب بھی یہ معاملہ صحیح ہوتا [لیکن اس صورت میں یعنی ہوٹل بنا کر دینے میں مضارب عمارت کے نفع میں -جبکہ وہ ہوٹل بیچا جائے- شریک نہ ہوگا]

اور ضابطہ میں کرنسی کے ساتھ "نقد" کی قید اس لئے ہے کہ اگر رأس المال (سرمایہ) دین ہے تو مضاربت صحیح نہیں، جیسے زید نے خالد کو کہا اس دین میں جو میرا تمہارے ذمہ ہے مضاربت کرو اور اس نے اسی میں مضاربت کی تو یہ مضاربت درست نہیں اگرچہ وہ دین کرنسی کی شکل میں ہو۔

ملحوظہ: یہ جو لکھا گیا ہے وہ اصل مسلک کے اعتبار سے ہے یعنی احناف کا اصل مسلک یہی ہے کہ عروض (سامان) میں مضاربت وشرکت جائز نہیں، لیکن موجودہ دور

---

(۱) (ولا تصح المضاربة إلا بمال تصح به الشركة) من النقدين والتبر والفلس النافق. (مجمع الأنهر: ۳۲۲/۲، شاملة) وشرطها: كون رأس المال من الأثمان. (تنوير الأبصار على هامش الدر والرد: ۶۴۷/۵، شاملة)

میں کاروباری مشکلات کے پیش نظر حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ نے مذہب مالکی کو اختیار کرتے ہوئے سامان میں بھی شرکت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (۱)

پس ضرورت کے وقت اس پر عمل جائز ہوگا مثلاً مضارب کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا باپ کے حصہ مضاربت کے بدلہ میں عمل (مینجمنٹ) کرنا چاہتا ہے تو سرمایا داروں کی اجازت سے یہ معاملہ جائز ہوگا اگرچہ سرمایا سامان کی صورت میں ہو کیونکہ یہاں اس کے باپ کے بسا ہوئے سامان کو کرنسی میں بدلنے میں حرج ہے۔ اسی طرح اگر کاروبار میں متعدد شرکاء ہوں اور کسی شریک کا انتقال ہو جائے تو اس کے وارثین دیگر شرکاء اور مضارب کی اجازت سے اس کاروبار کو جاری رکھ سکتے ہیں یہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ہے اور علماء احناف ضرورتاً اس پر فتویٰ دیتے ہیں۔ (۲)

۵۰۹-**ضابطہ:** مضاربت میں ہر ایسی شرط جو نفع میں جہالت یا شرکت کے ختم کا موجب ہو مضاربت کو فاسد کر دیتی ہے، اور جو شرط ایسی نہ ہو وہ خود باطل ہو جاتی ہے اور عقد صحیح رہتا ہے۔ (۳)

جیسے:

(۱) شرط لگائی کہ رب المال مضارب کے گھر میں ایک سال تک رہے گا اور وہی اس کا نفع ہوگا تو یہ مضاربت فاسد ہے کیونکہ نفع میں جہالت ہے۔ (۴)

---

(۱) (دیکھئے امداد الفتاوی: ۳/ ۴۹۵، کتاب الشرکۃ، مکتبہ زکریا دیوبند)

(۲) (مستفاد: ہوٹل کے مسائل ۶۸/ ۹۵/ ۹۶ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری)

(۳) كل شرط يوجب جهالةً في الربح أو بقطع الشركة فيه يفسدها وإلا بطل الشرط وصح العقد. (الدالمختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۴۳۳ - التاتارخانية: ۱۵/ ۳۹۷)

(۴) كل شرط فاسد في المضاربة يوجب جهالة الربح أو قطع الشركة في الربح يوجب فساد المضاربة، نحو أن يشترط المضارب أن يسكن رب المال داره سنة. (التاتارخانية: ۱۵/ ۳۹۷)

(۲) اسی طرح اگر شرط لگائی کہ ہر مہینے مضارب رب المال کو پانچ ہزار روپے دے گا یعنی نفع معین کرلیا تو مضاربت فاسد ہے کیونکہ اگر تجارت میں اتنا نفع نہ ہوا تو مضارب کو کچھ نہ ملے گا پس مآلاً یہ شرط نفع میں ختم شرکت کا موجب ہوگی (اس لئے مضاربت کی صحت کے لئے نفع کا تناسب مثلاً نصف، تہائی یا چوتھائی وغیرہ طے کرنا ضروری ہے، لگی بندھی رقم معین کرنا جائز نہیں) [۱]

اور جو شرط نفع میں جہالت یا شرکت کے ختم کا موجب نہ ہو تو اگرچہ وہ مضاربت کے اصول کے خلاف ہو لیکن اس سے مضاربت فاسد نہیں ہوتی بلکہ وہ شرط خود باطل ہوجاتی ہے، جیسے:

(۱) اگر رب المال نے شرط لگائی کہ نفع کا دو تہائی حصہ اور مزید ہر ماہ دو ہزار روپے لوں گا تو مضاربت صحیح ہوگی، رب المال دو تہائی نفع کا مستحق ہوگا اور دو ہزار کی شرط باطل ہوگی۔ [۲]

(۲) اسی طرح اگر شرط مضارب کی طرف سے ہو کہ نفع کا ایک تہائی حصہ اور مزید پانچ ہزار روپے بطور تنخواہ لوں گا تو مضاربت درست ہوگی، مضارب کو نفع کا ایک تہائی ملے گا اور ایک ہزار کی شرط غیر معتبر ہوگی۔ [۳]

(۳) یا یہ شرط لگائی گئی کہ مضارب نقصان (گھاٹا) میں بھی شریک ہوگا تو یہ شرط باطل ہوگی اور مضاربت صحیح رہے گی۔ [۴]

---

(۱) وإذا شرط للمضارب ربح عشرة فسدت لا لأنه شرط فاسد لكن لأنه شرط ينتفي به الشركة في الربح. (التاتارخانية: ۱۵/ ۳۹۷) وشرطها.... كون الربح بينهما شائعا فلو عين قدرا فسدت. (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۴۳۳)

(۲، ۳) إذا قال رب المال للمضارب: لك ثلث الربح وعشرة دراهم في كل شهر عملت فيه للمضاربة فالمضاربة جائزة والشرط باطل. (هندية: ۴/ ۲۸۷)

(۴) وإلا بطل الشرط كشرط الخسران على المضارب. (شامي: ۸/ ۴۳۳)

(۴) مضارب اور رب المال کے علاوہ کسی اجنبی (یعنی تیسرے شخص) کے لئے بعض نفع کی شرط لگائی گئی جبکہ وہ اجنبی مال مضاربہ میں کوئی عمل بھی نہیں کرتا ہے تو یہ شرط باطل ہے اور مضاربت جائز ہے اور مشروط کو مسکوت عنہ قرار دیا جائے گا کہ گویا اس کا ذکر ہی نہیں ہوا پس جو نفع اجنبی کے لئے بیان کیا گیا وہ رب المال کے لئے ہوگا، اب اگر وہ اجنبی کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن دینا لازم نہیں۔ (۱)

استثناء: البتہ یہ صورت ضابطہ سے مستثنیٰ ہے کہ: اگر رب المال کے لئے کام کی شرط لگائی گئی یعنی رب المال بھی مضارب کے ساتھ کام کرے گا تو- باوجود کہ یہ شرط نفع میں جہالت یا ختم شرکت کا موجب نہیں ہے لیکن- اس سے عقد فاسد ہو جاتا ہے کیونکہ یہ شرط مضاربت کے مقصد و ماہیت کے خلاف ہے، مضاربت نام ہی اسی کا ہے کہ ایک کی طرف سے سرمایا ہو اور دوسرے کی طرف سے عمل اور یہاں دونوں کی طرف سے عمل کی شرط ہے۔ (۲)

۵۱۰- **ضابطہ:** جو چیز تجار میں معروف ہو مضارب اس کا نفس عقد سے مالک ہوگا۔ (۳)

تفریعات:

(۱) پس کاروبار کی ترقی کے لئے دکان کی تعمیر، فرنیچر، دلالی، سرکاری کام کاج وغیرہ

---

(۱) واذا شرط في المضاربة بعض الربح لغير المضارب ورب المال فان شرط عمل الأجنبي فالمضاربة جائزة ... وان لم يشترط عمل الأجنبي فالمضاربة جائزة والشرط غير جائز ويجعل المشروط للأجنبي كالمسكوت عنه فيكون لرب المال۔ (ہندیہ: ۴/ ۲۸۹، رشیدیہ، کوئٹہ)

(۲) واشتراط عمل رب المال مع المضارب مفسد للعقد. (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/ ۴۴۲)

(۳) ماهو من صنيع التجار يملكه المضارب بمطلق العقد۔ (مبسوط: ۲۲-۳۶)

میں خرچ کرنا تاجروں کے یہاں جس قدر معروف ہو مضارب راس المال میں سے اتنا خرچ کرسکتا ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ جو چیز مبیع میں حقیقتاً یا حکماً زیادتی کا موجب ہو (یعنی کاروبار کی ترقی کا سبب ہو) مضارب اس میں راس المال کو استعمال کرسکتا ہے۔[1]

(۲) جب تک رب المال کی طرف سے صراحتاً اجازت نہ ہو مضارب اس کاروبار میں قرض دینے یا لینے کا حق نہیں رکھتا ہے۔[2] لیکن کاروباری مفاد کے پیش نظر نوکروں کو جس قدر قرض دینے کا عام رواج ہو وہ راس المال یا مشترک نفع میں سے دے سکتا ہے۔[3]

(۳) مضاربت کے مسائل میں ایک رب المال کے روپے کو دوسرے رب المال کے روپے سے یا اپنے روپے سے خلط کرنا دراصل ناجائز اور موجب ضمان ہے لیکن اگر تجار میں یہ معروف ہو اور موافق عرف کے ہر ایک رب المال کی طرف سے خلط کی اجازت ہو تو پھر جائز ہے اور اس خلط سے مضارب پر کوئی ضمان نہ آئے گا۔[4]

---

(۱) وكذا يضم إلى رأس المال ما يوجب زيادة فيه حقيقة أو حكما أو اعتاده التجار) كأجرة السمسار هذا هو الأصل نهاية. (الدر المختار) قد سبق في المرابحة أن العبرة في الضم لعادة التجار فإذا جرت بضم ذلك يضم ط. (شامی: ۸/۴۴۸ --- تاتارخانیہ: ۱۵/ ۴۵۴)

(۲) وليس له أن يضارب.... ولا أن يقرض أو يستدين أو يهب أو يتصدق إلا بتنصيص (ملتقى الابحر: ۱/ ۴۴۸ شاملة)

(۳) (کاروباری مسائل: ۶۵ مفتی احمد صاحب خانپوری)

(۴) (فتاوی دارالعلوم: ۱۳/ ۹۹) لا يكون المضارب في المضاربة مأذونا بمجرد عقد المضاربة بخلط مال المضاربة بماله ولا باعطائه مضاربة, لكن إذا كان في بلدة من العادة فيها أن المضاربين يخلطون مال المضاربة بمالهم فيكون المضارب مأذونا بذلك في المضاربة المطلقة أيضا. (مجلة الأحكام العدلية: ۱/ ۲۷۴ شاملة)

(۴) تجار کے عرف میں نوکروں کو بطور تحفہ ان کے تہوار میں کوئی چیز دینے کا رواج ہو تو تجارت کے مفاد کے لئے دینے کی اجازت ہوگی۔[۱]

۵۱۱- **ضابطہ**: رب المال کی طرف سے لگائی گئی قیودات میں جو قید مفید ہو مضارب پر اس کی رعایت لازم ہوگی اور جو غیر مفید ہو اس کی رعایت لازم نہ ہوگی۔[۲]

جیسے کہا اس بازار کے علاوہ کسی اور بازار میں نہ بیچنا؛ یا اس شہر کے علاوہ کسی اور شہر میں کاروبار نہ کرنا؛ یا اسی مخصوص چیز کا کاروبار کرنا؛ یا اس کاروبار کے ساتھ اپنا کوئی دوسرا کاروبار نہ کرنا؛ تو یہ سب شرائط فی الجملہ مفید ہیں اس لئے مضارب پر ان کی رعایت لازم ہوگی،[۳] اگر رعایت نہیں کرے گا تو حکم یہ ہے کہ مضارب رأس المال کا ضامن ہوگا اور نفع اور نقصان اسی کے ساتھ متعلق ہوگا، البتہ اس کو چاہئے کہ اس نفع کا صدقہ کردیں یہ طرفین کا مسلک ہے جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مضارب اس نفع کو استعمال کرسکتا ہے۔[۴]

اور جو شرط غیر مفید ہو جیسے نقد بیع نہ کرنا؛ دکان میں فلاں بزرگ کی تصویر رکھنا؛ یا سخت سردی یا گرمی میں دکان بند کرلینا حالانکہ اس موسم میں کاروبار سے کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے؛ تو ان جیسی شرائط کی رعایت مضارب پر لازم نہیں۔

---

(۱) (کاروباری مسائل: ۶۹ مفتی احمد صاحب خانپوری)

(۲) والأصل فيه أن القيد إن كان مفيدا يثبت.... وإن لم يكن مفيدا لا يثبت بل يبقى مطلقا، لأن ما لا فائدة فيه يلغو ويلحق بالعدم. (بدائع الصنائع: ۱۳۷/۵ في بيان حكم المضاربة، مكتبہ زكريا)

(۳) (ہندیہ: ۲۹۷/۴، مجمع الانہر: ۳۲۵/۲)

(۴) فإن فعل ضمن بالمخالفة وكان ذلك الشراء له (الدر المختار) وفي الشامية: (الشراء له) وله ربحه، وعليه خسرانه، ولكن يتصدق بالربح عندهما وعند أبي يوسف يطيب له. (شامی: ۴۳۷/۸)

۵۱۲- ضابطہ: مضارب سرمایہ کے تصرف میں رب المال کا وکیل ہوتا ہے (پس اس پر وکیل کے احکام جاری ہوں گے) [1]

تشریح: اور وکیل کے حکم میں یہ تفصیل ہے:

۱- وکیل اپنے نفس اور اصول فروع سے عقد نہیں کرسکتا۔

۲- اگر موکل یہ کہدے کہ "جس سے چاہو معاملہ کرسکتے ہو" تو اصول وفروع سے عقد صحیح ہے مگر اپنے نفس اور اولاد صغار سے عقد صحیح نہیں۔

۳- اگر موکل عقد بالنفس اور الولد الصغیر کی بھی صراحتاً اجازت دیدے تو اس میں جواز اور عدم جواز دونوں قول ہیں۔ [2]

تفریعات:

(۱) پس جو شخص ہوٹل یا کمپنی کو بطور مضاربت چلا رہا ہے وہ اس ہوٹل، یا کمپنی کی گاڑی

(۱) ومن جهة تصرفه في رأس المال وكيل لرب المال (مجلة الاحكام العدلية: ۱/۲۷۳، المادة ۱۴۱۳ شاملة)

(۲) لا يعقد وكيل البيع والشراء والإجارة والصرف والسلم ونحوها (مع من ترد شهادته له) للتهمة وجوزاه بمثل القيمة (إلا من عبده ومكاتبه إلا إذا أطلق له الموكل) كبع ممن شئت (الدرالمختار) وفي الشامية: (قوله إلا من نفسه) وفي السراج: لو أمره بالبيع من هؤلاء فإنه يجوز إجماعا إلا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أو عبده ولا دين عليه فلا يجوز قطعا وإن صرح به الموكل اهـ منح. الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه؛ لأن الواحد لا يكون مشتريا وبائعا فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه، وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لا تقبل شهادته فباع منهم جاز بزازية كذا في البحر، ولا يخفى ما بينهما من المخالفة، وذكر مثل ما في السراج في النهاية عن المبسوط، ومثل ما في البزازية في الذخيرة عن الطحاوي، وكأن في المسألة قولين خلافا لمن ادعى أنه لا مخالفة بينهما. (شامی: ۸/۲۵۷)

کو اپنی ذاتی ضرورت میں کرایہ دے کر بھی استعمال نہیں کرسکتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے نفس سے عقد کرنے والا ہوگا اور مضارب کا اپنے نفس عقد کرنا جائز نہیں۔

(۲) مضارب جو ہوٹل چلا رہا ہے وہ اپنے گھر کے لئے کھانا قیمت دے کر بھی پارسل نہیں لے جاسکتا ہے کہ اس میں اپنے نفس (یا اصول وفروع یا اولاد صغار سے) عقد کرنا لازم آتا ہے۔

(۳) مضارب اپنی ذاتی دکان میں مال مضاربت رکھ کر اس دکان کا کرایہ مشترک نفع یا راس المال میں سے وصول کرے تو اس طرح کرایہ لینا جائز نہیں کہ یہ بھی عقد بالنفس کی صورت ہے۔

البتہ ایک قول میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا رب المال کی طرف سے صراحتاً اجازت ہو تو مضارب اپنے نفس سے عقد کرسکتا ہے، اس کی بنیاد پر ان تینوں مسائل میں صراحتاً اجازت کے بعد جواز کا حکم ہوگا، احسن الفتاویٰ میں کاروباری دشواریوں کے پیش نظر آخری مسئلہ میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[1]

(۴) مضارب اپنے اصول (ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی) اور فروع (بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی) سے مضاربت کے مال کو نہ بیچ سکتا ہے اور نہ ان سے خرید سکتا ہے، مگر یہ کہ رب المال کی طرف سے صراحتاً اجازت ہو یا یوں کہا گیا ہو کہ ”جس سے چاہے معاملہ کرسکتے ہو“ تو پھر اصول وفروع سے عقد جائز ہوگا۔

۵۱۳- **ضابطہ:** نفع میں مضارب کا حق معاملہ ختم ہونے کے بعد متعلق ہوتا ہے۔

تشریح: پس نفع حاصل ہوتے ہی مضارب وہ نفع لینے کا حق دار نہ ہوگا، بلکہ اگر رب المال کی اجازت سے آپس میں نفع کی تقسیم کی گئی ہے تب بھی نقصان ہونے پر اس قدر نفع واپس کرنا ضروری ہوگا، مثلاً دو شخصوں کے درمیان تین سال تک مضاربت

(۱) (دیکھئے: احسن الفتاویٰ: ۷/ ۲۴۸)

کا معاہدہ ہوا اس کے بعد دو سال تک نفع ہوتا رہا اور ہر سال علی الحساب نفع کی تقسیم عمل میں آئی لیکن تیسرے سال بجائے نفع کے نقصان ہوگیا تو یہ تین سالہ مدت ایک ہی معاملہ مضاربت کی ہے لہذا تیسرے سال جو نقصان ہوا پہلے اس نقصان کی تلافی گذشتہ دو سالوں کے نفع سے کی جائے گی پھر اگر اس سے بھی نقصان کی تلافی نہیں ہوتی تو اصل سرمایہ سے تلافی کی جائے گی ـــــ رأس المال ہلاک ہوجائے یا چوری ہوجائے تو بھی یہی حکم ہے کہ اولاً نفع سے اس کی تلافی کی جائے گی پھر نفع سے زیادہ ہو تو اس زائد میں مضارب ضامن نہ ہوگا۔ (۱)

۵۱۴- **ضابطہ**: مضارب کے تصرفات کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ: تصرفات تین قسم کے ہیں: ایک وہ جو باب مضاربت اور اس کے توابع میں سے ہیں جیسے خرید و فروخت کرنا، وکیل بنانا، رہن رکھنا، کرایہ پر لگانا کسی کو مزدور مقرر کرنا کسی کے پاس مال امانت رکھنا وغیرہ تو مضارب نفس عقد ہی سے ان تصرفات کا مجاز ہوگا خواہ رب المال کی طرف سے اجازت ہو یا نہ ہو ـــــ دوسری قسم ان تصرفات کی ہیں جن کا مضارب نفس عقد سے مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ اس وقت مالک ہوتا ہے جب کہا جائے کہ تم جو مناسب سمجھو کرو (إذا قيل له اعمل مابدالک) وہ تصرفات یہ ہیں: مضارب کا دوسرے کو مضاربت کے طور پر وہ سامان دینا یا کسی کو اس تجارت میں شریک کرنا یا

(۱) وما هلك من مال المضاربة صرف إلى الربح أولا فإن زاد الهالك على الربح لا يضمن المضارب، (إلى قوله:) وإن اقتسماه من غير فسخ ثم هلك المال كله أو بعضه (ترادّاه) أي المضارب والمالك الربح المقسوم حتى يتم رأس المال لأن الربح تابع فلا يسلم بدون سلامة الأصل فإن فضل شيء من الربح بعدما استوفى رأس المال (اقتسماه) أي ما فضل لأنه ربح. وإن لم يف أي ربح ما هلك من رأس المال (فلا ضمان على المضارب) لأنه أمين فيه. (مجمع الأنهر: ۲/۳۳۲)

اپنے یا دوسرے کے مال کے ساتھ اس مال کو خلط کرنا ـــــ تیسری قسم ان تصرفات کی ہیں جن کا مضارب نہ نفس عقد سے مالک ہوتا ہے اور نہ مطلق اختیار دینے سے بلکہ ان میں صراحتاً اجازت ضروری ہے ان تصرفات میں قرض دینا، قرض لینا، ہبہ کرنا، صدقہ کرنا وغیرہ ہے کیونکہ کاروباری نقطہ سے ان تصرفات میں نقصان ہونا یقینی ہے یا امکان زیادہ ہے۔ (۱)

۵۱۵-**ضابطہ:** مضارب اگر تجارت کے لئے سفر کرے تو اس کا کھانا، پینا لباس، سواری، کپڑا دھلائی اور جتنا خرچ عادتاً تجار کا معمول ہو یہ سب مال مضاربہ سے ہوگا اور اگر اپنے شہر میں کام کرے (خواہ وہ شہر اس کی جائے پیدائش ہو یا اس کو وطن بنالیا ہو) تو نفقہ اس کا اپنے مال میں ہوگا۔ (البتہ علاج کا خرچ بہرحال مضارب خود کرے گا) (۲)

---

(۱) والأصل أن التصرفات في المضاربة ثلاثة أقسام: قسم: هو من باب المضاربة، وتوابعها فيملكه من غير أن يقول له: اعمل ما بدا لك كالتوكيل بالبيع والشراء والرهن والارتهان والاستئجار والإيداع والإبضاع والمسافرة وقسم: لا يملك بمطلق العقد بل إذا قيل اعمل برأيك كدفع المال إلى غيره مضاربة أو شركة أو خلط مالها بماله أو بمال غيره، وقسم: لا يملك بمطلق العقد، ولا بقوله: اعمل برأيك إلا أن ينص عليه، وهو ما ليس بمضاربة ولا يحتمل أن يلحق بها كالاستدانة عليها اهـ ملخصا. (شامی: ۸/۴۳۵)

(۲) (وإذا سافر) ولو يوما (فطعامه وشرابه وكسوته وركوبه) بفتح الراء ما يركب ولو بكراء (وكل ما يحتاجه عادة) أي في عادة التجار بالمعروف (في مالها) لو صحيحة لا فاسدة.... (وإن عمل في المصر) سواء ولد فيه أو اتخذه دارا (فنفقته في ماله) كدوائه على الظاهر. (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۸/۴۴۶، الجامع الصغير مع شرحه النافع الكبير: ۱/۴۲۳)

تشریح: اور حالت سفر کا نفقہ بھی اولاً نفع میں سے محسوب ہوگا، اگر نفع نہ ہو تو پھر اصل سرمایہ میں سے ماخوذ ہوگا۔[1]

اور تجارت کے لئے جس شہر میں سفر کرے اس میں خواہ ایک دن رکنے کی نیت کرے یا پندرہ دن کی نیت کرے نفقہ بہر صورت مال مضاربہ سے ہوگا۔ البتہ اگر اس شہر میں اس کے اہل رہتے ہوں تو پھر اس کا نفقہ مال مضاربہ سے ساقط ہو جائے گا اور خود کے ذمہ ہو جائے گا جیسا کہ شرح الطحطاوی میں ہے۔[2]

۵۱۶-**ضابطہ**: مضاربت فاسدہ مآل کے لحاظ سے اجارۂ فاسدہ ہے۔[3]

تشریح: پس اگر مضاربت فاسد ہوگئی مثلاً شرط لگائی کہ روپیہ ایک کا ہوگا اور کام دونوں کریں گے، یا رب المال ہر ماہ ایک معین نفع مثلاً دو ہزار یا پانچ ہزار لیا کرے گا یا مضارب رأس المال میں بھی شریک رہے گا وغیرہ تو ان سب فاسد صورتوں میں مضاربت انجام کار اجارۂ فاسدہ ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ مضارب اس میں اجرت مثل (یعنی بصورت ملازمت کام کرنے کی صورت میں جو تنخواہ مل سکتی تھی) یا منافع مقررہ میں سے جو کم ہو اس کا حقدار ہوگا (اور سارا نفع یا نقصان رب المال کے لئے ہوگا) جیسا کہ

---

(۱) وسبيل النفقة أن تحسب من الربح إن كان وإن لم يكن له فهو من رأس المال. (تاتارخانیہ جدید: ۱۵/ ۴۵۱)

(۲) وفي شرح الطحطاوي: فإن خرج من ذالك المصر فإن نفقته في مال المضاربة إذا خرج بنية التجارة سواء كان مدة السفر أو دونها فإذا وصل إلى المصر الذي قصده ينظر إن كان ذالك المصر مصر نفسه أو يكون له في ذلك المصر أهل سقطت نفقته متى دخله لأنه ليصير مقيما بدخوله، وإن لم يكن ذالك مصره ولم يكن له فيه أهل فإن نفقته لا تسقط مادام مقيما فيه لأجل المال وإن نوى اقامة خمسة عشر يوما. (تاتارخانیہ جدید: ۱۵/ ۴۴۵)

(۳) واجارة فاسدة إن فسدت (الدر المختار: ۸/ ۴۳۱)

اجارۂ فاسدہ میں مستاجر اجرت مثل یا مقررہ اجرت میں سے جو کم ہو اس کا حق دار ہوتا ہے۔[۱]

۵۱۷- **ضابطہ**: جن چیزوں سے وکالت ختم ہو جاتی ہے عقد مضاربت (اور شرکت) بھی ختم ہو جاتا ہے۔[۲]

تشریح: پس رب المال یا مضارب کی موت سے؛ یا کسی ایک کے جنون (پاگل پن) سے؛ یا سرمایہ کار کے نعوذ باللہ مرتد ہونے سے؛ یا سرمایہ کار کا مضارب کو معزول کرنے سے جب کہ مضارب کو معزولی کا علم بھی ہو جائے؛ عقد مضاربت ختم ہو جائے گا جیسا کہ ان سب صورتوں میں وکالت ختم ہو جاتی ہے۔[۳]

البتہ معزولی کے وقت سرمایہ اگر سامان کی صورت میں ہو (یعنی مضارب نے سامان خرید لیا ہے) تو اس وقت تک معزول نہ ہوگا جب تک کہ وہ اس سامان کو بیچ کر کرنسی کی صورت نہ دیدے اور نفع یا نقصان ظاہر نہ ہو؛ برخلاف وکیل کے کہ اس کا یہ حکم نہیں موکل جب بھی معزول کرے علم ہو جانے کے بعد وہ معزول ہو جاتا ہے۔[۴]

(۱) فلا ربح للمضارب حينئذ بل له اجر مثل عمله مطلقاً ربح او لا بلا زيادة على المشروط (الدرالمختار: ۴۳۱/۸)

(۲) وكل ما تبطل به الوكالة تبطل به المضاربة. (بدائع الصنائع: ۱۵۷/۵)

(۳) (مستفاد: بدائع: ۱۵۸/۵-۱۵۷ ازکریا، شامی: ۴۴۲/۸-۴۴۳ زکریا البنایۃ شرح الہدایۃ: ۷۵/۱۰ شاملۃ، اللباب: ۱۳۵/۲ شاملۃ)

(۴) ومنها: أن المضارب إذا اشترى بمال المضاربة عروضا ثم عزله رب المال عن المضاربة لا يعمل عزله وإن علم به بخلاف الوكيل على ما يجيء. (البناية شرح الهداية: ۷۶/۱۰، شاملة)

کتاب الشرکۃ

۵۱۸-**ضابطہ:** مباحات میں شرکت کا معاملہ درست نہیں۔[۱]

تشریح: مباحات یعنی جس کی عام اجازت ہوتی ہے جیسے شکار کرنا، سرکاری زمین سے گھاس کاٹنا، نہر یا تالاب سے مچھلی پکڑنا، سمندر سے جواہرات نکالنا وغیرہ ان میں شرکت کا معاملہ درست نہیں بلکہ اس چیز کو جو شخص پائے گا اور قبضہ کرے گا وہ اسی کی ہوگی دوسرا اس میں شریک نہ ہوگا (مگر یہ کہ پانے والا اپنے ساتھی کو کچھ ہدیۃً دینا چاہے تو دے سکتا ہے) کیونکہ ان چیزوں میں وکیل بنانا ہی درست نہیں جبکہ شرکت کی بنیاد وکالت پر ہے، یہی وجہ ہے کہ جس شخص میں وکالت کی اہلیت نہیں ہوتی ہے جیسے ناسمجھ بچہ، مجنون وغیرہ اس کے ساتھ شرکت کا معاملہ درست نہیں۔[۲]

۵۱۹-**ضابطہ:** عروض (سامان) میں عقد شرکت جائز نہیں۔[۳]

تشریح: پس بوقت عقد سرمایہ کا کرنسی میں ہونا ضروری ہے، اگر "سرمایہ" سامان کی صورت میں ہے تو عقد درست نہیں، یہ احناف کے نزدیک ہے۔

البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عروض میں بھی عقد شرکت و مضاربت جائز ہے اور مضاربت کے باب میں گزر چکا ہے کہ حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ نے امداد الفتاویٰ میں بوجہ ابتلائے عام اس مسئلہ میں امام مالک کا قول اختیار کیا ہے، پس فی زمانہ کاروباری مشکلات کے پیش نظر ضرورتاً اس پر عمل کی گنجائش ہوگی۔[۴]

---

(۱) (الدر المختار مع ھامش رد المحتار: ۵/ ۵۰۱ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)

(۲) (بدائع: ۵/ ۷۷) (۳) فلا تصح الشرکۃ فی العروض۔ (بدائع: ۵/ ۷۷)

(۴) (دیکھئے امداد الفتاویٰ: ۳/ ۴۹۵، کتاب الشرکت، مکتبہ زکریا دیوبند)

۵۲۰- **ضابطہ:** جہاں شرکت مفاوضہ صحیح نہ ہو لیکن شرکت عنان کے صحیح ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہو تو وہ شرکت ''شرکت عنان'' میں تبدیل ہوجاتی ہے۔[1]

تشریح: شرکت مفاوضہ یہ ہے کہ دو آدمی اس طرح شریک ہوں کہ دونوں کا سرمایہ مساوی ہو اور تصرفات اور تجارتی واجبات میں دونوں کو برابر کا حق حاصل ہو گویا شرکت کی اس صورت میں حقوق کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے وکیل ہوتے ہیں جبکہ ذمہ داریوں کے عائد ہونے کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے کفیل ہوتے ہیں ــــ اور شرکت عنان یہ ہے کہ: دو شخصوں کا مشترک سرمایہ ہو خواہ برابر ہو یا کم وبیش، پھر تجارت کی جائے اور نفع کی تقسیم طے شدہ تناسب سے عمل میں آئے، شرکت کی اس صورت میں سرمایہ کا مساوی ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد ہوتی ہے اسی بنا پر اس میں کفالت کی اہلیت شرط نہیں صرف وکالت کی اہلیت کافی ہے۔ اس شرکت کے جواز میں سب کا اتفاق ہے اور اس میں بوجہ سہولت وآسانی کے اس کا وقوع بھی بکثرت ہے جبکہ شرکت مفاوضہ کے جواز میں ائمہ کا اختلاف ہے صرف احناف کے یہاں وہ جائز ہے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز نہیں اور اس کا وقوع بہت نادر ہے۔[2]

اس تمہید کے بعد ضابطہ کی تشریح یہ ہے کہ: جہاں شرکت مفاوضہ صحیح نہ رہے- جیسے شرکت مفاوضہ کے کسی شریک کو ہدیہ یا صدقہ یا میراث میں کچھ مال مل جائے تو اس سے شرکت مفاوضہ ختم ہوجاتی ہے- تو اگر وہاں شرکت عنان کے لئے کوئی شرط مانع نہ

---

(۱) كل موضع لم تصح المفاوضة لفقد شرط ولا يشترط ذلك في العنان كان عناناً، لاستجماع شرائط العنان. (اللباب فی شرح الکتاب: ۲/ ۱۲۳، البحر الرائق ۱۸۳/۵)

(۲) (مستفاد: شامی: ۶/ ۴۷۵- ۴۸۳، اللباب فی شرح الکتاب: ۲/ ۱۲۵- ۱۲۲، الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۴/ ۸۱۵، بدائع الصنائع: ۵/ ۷۵- ۸۲)

ہوتو وہ شرکت خود بخود ''شرکت عنان'' میں تبدیل ہوجائے گی اوراس میں شرکت عنان کے احکام جاری ہوں گے۔

لیکن اگر کوئی چیز مانع ہو جیسے اس ملک میں مختلف قسم کی کرنسایاں: ڈالر، روپیہ وغیرہ برابر طریقہ پر رائج ہوں تو نفع میں کرنسی کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے اس صورت میں شرکت مفاوضہ شرکت عنان میں تبدیل نہ ہوگی، بلکہ اب باقاعدہ کسی معین کرنسی پر مستقلاً شرکت عنان کا عقد ضروری ہوگا کیونکہ شرکت عنان میں کرنسی کی تعیین شرط ہے۔(۱)

۵۲۱- **ضابطہ**: غیر عامل شریک کا سرمایہ کے تناسب سے زیادہ لینا جائز نہیں۔(۲)

تشریح: شرکت میں اگر تمام سرمایہ دار عمل کرتے ہوں تو کم وبیش جو چاہے فیصد نفع متعین کرسکتے ہیں خواہ سرمایہ کے تناسب سے زیادہ ہو یا کم، لیکن اگر کوئی شریک عمل نہ کرتا ہو تو اس بے عمل شریک کے لئے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع لینا جائز نہ ہوگا مثلاً کسی شریک کا سرمایہ نصف ہے اور وہ کچھ عمل نہیں کرتا ہے تو شرح نفع میں سے نصف سے زیادہ لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا اس کے لئے نفع کا نصف یا اس سے کم کی تعیین ضروری ہے، کیونکہ زائد اس کے حق میں بلا عوض ہو کر سود ہوجاتا ہے۔

اور عمل کرنے والا شریک جس قدر چاہے نفع متعین کرسکتا ہے اس لئے کہ سرمایہ کے تناسب سے جو زیادہ نفع ہوگا وہ اس کی محنت کا عوض ہوگا پس اس صورت میں اس

---

(۱) قوله: (ولا يشترط ذلك في العنان) جملة حالية احترز بها عما يشترط في العنان أيضا كعدم اشتراط دراهم معلومة من الربح لأحدهما فلا تكون عنانا أيضا (شامی: ۶/ ۴۷۷)

(۲) مع التفاضل في المال دون الربح وعكسه (درمختار) وإن شرط الربح للعامل أكثر من رأس ماله جاز (شامی: ۶/ ۴۸۴، زکریا)

کے حق میں یہ عقد "مضاربہ" اور "مشارکہ" دونوں کا مجموعہ ہوگا۔

فائدہ: شرکت میں بھی مضاربت کے مثل نفع کا فیصد یعنی چالیس فیصد، پچاس فیصد اس طرح طے کرنا ضروری ہے معین نفع جیسے ہر مہینے پانچ ہزار دیں گے یہ جائز نہیں، اس سے شرکت فاسد ہو جاتی ہے۔ (۱)

۵۲۲- **ضابطہ:** شریک کا ہر وہ تصرف جس میں مال تلف ہوتا ہو یا بلاعوض کسی کو مالک بنانا لازم آتا ہو بلا اجازت شرکاء جائز نہیں۔ (۲)

تفریع: پس شرکاء میں سے کوئی بھی شریک خواہ وہ سرمایہ میں عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو سرمایہ یا اس کے نفع کو (جو مال مشترکہ ہے) نہ کسی کو ہدیہ وصدقہ کر سکتا ہے، نہ قرض دے سکتا ہے اور نہ رہن رکھ سکتا ہے ان تصرفات کے لئے اس کو دیگر شرکاء سے صراحتاً اجازت لینا ضروری ہوگا کیونکہ ہدیہ وصدقہ میں مال کا تلف اور قرض وغیرہ میں بلاعوض مال کا دینا لازم آتا ہے۔ (۳)

ان کے علاوہ باقی تصرفات جیسے مال کو اجرت پر دینا، ادھار بیچنا، یا کسی کے پاس امانت رکھنا، یا کام کے لئے ملازمین مقرر کرنا، یا کسی کو خرید فروخت کا وکیل بنانا یا یا تجارتی مقاصد کے تحت کسی سے قرض لینا وغیرہ سب تصرفات شریک عامل کے لئے جائز ہے ان تصرفات میں مستقل اجازت کی ضرورت نہیں۔ (۴)

---

(۱) وتفسد باشتراط دراهمه مسماة من الربح لأحدهما تقطع الشركة كما مر۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۶/ ۴۸۹)

(۲) وكذا كل ما كان اتلافا للمال أو كان تمليكاً للمال بغير عوض۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۶/ ۴۹۳ زکریا، مجمع الأنهر: ۱/ ۷۲۳)

(۳) لا يملك الشريك الشركة.....ولا الرهن... ولا الهبة...ولا القرض إلا باذن شريكه إذنا صريحا فيه۔ سراج۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۶/ ۴۹۲)

(۴) ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يستأجر ... ويبضع أي يدفع ←

استدراک: لیکن اگر کوئی شریک وہ مال کسی اور کو شرکت پر دے- تو اگرچہ اس میں مال کا تلف یا بلا معاوضہ دینا نہیں ہے مگر- یہ بلا اجازت جائز نہیں ہے، برخلاف اگر مضاربت پر دے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ عام اصول یہ ہے کہ شیء ہمیشہ اپنے سے مافوق کے تابع ہوتی ہے اپنے مثل یا کم تر کے تابع نہیں ہوتی ہے اور مضاربت اور شرکت میں عقد شرکت مضاربت سے درجہ میں بڑھا ہوا ہے (کیونکہ وہ اصل اور فرع یعنی سرمایہ اور نفع دونوں میں شرکت کا موجب ہے جبکہ مضاربت صرف فرع یعنی نفع میں شرکت کا موجب ہے) لہٰذا عقد مضاربت میں مضارب دوسرے کو مال مضاربہ- بلا اجازت رب المال- نہ مضاربت پر دے سکتا ہے اور نہ شرکت پر کیونکہ مضاربت اس عقد کا مثل اور شرکت اس سے مافوق ہے لہٰذا تبعاً ان کی اجازت نہ ہوگی، جبکہ عقد شرکت میں شریک مال مشترک کو مضاربت پر تو دے سکتا ہے کیونکہ یہ شرکت سے کم درجہ ہے لیکن شرکت پر نہیں دے سکتا ہے کیونکہ وہ اس عقد کا مثل ہے، پس شرکت پر دینے کے لئے دیگر شرکاء سے مستقل اجازت کی ضرورت ہوگی، تبعاً اس کی اجازت نہ ہوگی۔[1]

← المال بضاعة بأن يشترط الربح لرب المال، ويودع...ويضارب ويوكل أجنبيا ببيع وشراء...ويبيع بنقد ونسيئة (الدر المختار على هامش رد المحتار:۶/۴۹۱-۴۹۰)

(۱) وهل له أن يدفع مال الشركة مضاربة؟ ذكر محمد في الأصل عن أبي حنيفة أنه له ذلك، وروى الحسن عن أبي حنيفة أنه ليس له ذلك....والاستدلال بالشركة غير سديد؛ لأن الشركة فوق المضاربة؛ لأنها توجب الشركة في الأصل والفرع؛ والمضاربة توجب الشركة في الفرع لا في الأصل، والشيء يستتبع ما هو دونه ولا يستتبع ما هو فوقه أو مثله، ولهذا لا يملك المضارب أن يدفع المال مضاربة بمطلق العقد؛ لأن المضاربة مثل المضاربة ...الخ (بدائع الصنائع:۵/۹۳، شامی:۶/۴۹۲ مکتبہ زکریا)

۵۲۳-**ضابطہ**: ہر شرکت فاسدہ میں نفع بقدر مال تقسیم کیا جائے گا، اس میں زیادتی کی شرط معتبر نہ ہوگی۔(۱)

تشریح: اگر شرکت کسی وجہ سے فاسد ہوگئی جیسے نفع کی تقسیم بجائے فیصد مقرر کرنے کے قطعی مقدار میں طے کی گئی مثلاً اس شریک کو ہر ماہ پانچ ہزار دینا ہوگا تو یہ شرکت فاسد ہے اس صورت میں نفع بقدر مال وسرمایہ کے تقسیم کیا جائے گا یعنی جس کا جتنا سرمایہ ہوگا اس کے تناسب سے نفع کی تقسیم عمل میں آئے گی اگر کسی کے لئے سرمایہ سے زیادہ کی شرط رکھی گئی ہو تو بر بنائے فساد اس کے لئے وہ زیادتی جائز نہ ہوگی، یہاں تک کہ عامل شریک بھی اپنے مال کے بقدر ہی نفع لے سکتا ہے اپنے کام کی اجرت کے نام پر کچھ زیادہ لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا، کیونکہ شریک کے لئے اپنے عمل کی بنیاد پر کچھ زیادہ نفع لینا یعنی نفع کا فیصد کچھ بڑھا کر طے کرنا تو جائز ہے لیکن اس کا عمل کی اجرت (تنخواہ) لینا جائز نہیں کیونکہ مال مشترک میں (یعنی جس مال میں وہ خود شریک ہو اس میں) عمل کی اجرت لینا جائز نہیں جیسا کہ فقہاء نے قفیز طحان کے تحت اس کو بیان کیا ہے اور پھر یہاں تو چونکہ شرکت فاسد ہوگئی ہے اس لئے اجرت کے علاوہ نفع کی زیادہ مقدار بھی لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا، اب شرکت فاسدہ میں صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ: "ہر ایک کے سرمایہ کے حساب سے برابر نفع کی تقسیم عمل میں آئے"۔(۲)

۵۲۴-**ضابطہ**: ہر وہ شخص جس کو مشترک چیز کی اصلاح ومرمت کے خرچ میں مجبور کیا جاسکتا ہو اگر بغیر اجازت کے اس کا دوسرا شریک تنہا وہ کام کردے تو وہ

---

(۱) وكل شركة فاسدة فالربح فيها على قدر المال، ويبطل شرط التفاضل. (اللباب في شرح الكتاب: ۲/۱۳۰)

(۲) (قوله: والربح إلخ) .... ولم يذكر أن لأحدهم أجرا لأنه لا أجر للشريك في العمل بالمشترك كما ذكروه في قفيز الطحان. (شامی: ۶/ ۵۰۳)

(اصلاح کرنے والا) متبرع ہوگا ورنہ نہیں۔[۱]

تشریح: جیسے چکی، حمام، کشتی، گاڑی وغیرہ ناقابل تقسیم چیز جب دو شخصوں کے درمیان مشترک ہو اور اس میں کوئی نقصان ہو جائے تو عام قاعدہ یہی ہے کہ دوسرے شریک کو اس کی اصلاح ومرمت کے خرچ پر مجبور کیا جاتا ہے اگر وہ انکار کردے تو اس پر مقدمہ (کیس) دائر کیا جاسکتا ہے لیکن پہلے شریک نے دوسرے شریک کی یا قاضی کی اجازت کے بغیر تنہا وہ کام کرلیا تو اس میں وہ متبرع ہوگا اب اپنے شریک کے پاس سے اس کا تاوان وہرجانہ وصول نہیں کرسکتا ہے کیونکہ جب اس کو یہاں چارہ جوئی حاصل تھی کہ وہ اپنے شریک کو مجبور کرے پھر بھی اس کی اجازت کے بغیر یہ کام کرلیا تو یہ اس کی طرف سے تبرع ہی مانا جائے گا۔

لیکن اگر اپنے شریک کی اجازت سے یا قاضی کے حکم سے اس نے تنہا یہ خرچ کیا ہے تو اس صورت میں وہ متبرع نہ ہوگا دوسرے شریک سے بقدر شرکت ہرجانہ وصول کرسکتا ہے۔[۲]

اور اگر کام ایسا ہو کہ دوسرے شریک کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے جیسے نیچے کی منزل ایسی خستہ ہوگئی کہ اوپر کی منزل گرنے کا اندیشہ ہے تو اوپر کی منزل والا نیچے والے کو اس کے صحیح کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا ہے، ایسی صورت میں اگر اوپر والے نے اپنے ساتھی سے پوچھے بغیر نیچے کی عمارت کو صحیح کردیا تو یہ اس کی طرف سے تبرع نہ ہوگا وہ اپنے اس شریک (نیچے والے) سے اس کے خرچ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح مشترک دیوار پر کسی ایک کی چھت کا بوجھ ہو اور دیوار خستہ ہوگئی ہو جس سے چھت گرنے کا اندیشہ ہو تو اگر چھت والا اپنے ساتھی سے پوچھے بغیر اس دیوار کی مرمت کردے تو وہ

---

(۱) قلت: والضابط أن كل من أجبر أن يفعل مع شريكه إذا فعله أحدهما بلا إذن فهو متطوع وإلا لا (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۶/ ۵۱۲)

(۲) (الدر والشامی: ۶/ ۵۱۵-۵۱۲)

اس مرمت کے خرچ کا بقدر حصہ مطالبہ کرسکتا ہے۔[1]

لیکن یہ (یعنی عدم اجبار کی صورت میں عدم تبرع) اس وقت ہے جبکہ کام کرنے والا اس میں مضطر ہو (جیسا کہ ان دو مثالوں سے واضح ہوا کہ اوپر کی منزل والا اور چھت والا کام کرنے پر مضطر تھا) اگر کام کرنے والا مضطر نہ ہو جیسے مثلاً کوئی مشترک مکان ایسا ہے کہ اس کو تقسیم کیا جاسکتا ہے یا دیوار ایسی ہے کہ وہ اپنی بنیاد کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے اور اس میں کوئی نقصان ہوگیا ہے تو یہاں اگرچہ عدم جبر کی صورت ہے لیکن اگر اپنے ساتھی سے اجازت کے بغیر کام کرلیا تو اس میں وہ متبرع ہوگا چنانچہ اپنے ساتھی سے اس کا کوئی خرچ وصول نہیں کرسکتا ہے کیونکہ اس کے لئے ممکن تھا کہ اپنے حصے کو الگ کردے اور صرف اسی میں کام کرے۔[2]

۵۲۵-**ضابطہ**: وہ تمام چیزیں جن سے وکیل وکالت سے معزول ہوجاتا ہے ان سے عقد شرکت باطل (ختم) ہوجاتا ہے۔[3]

تشریح: پس جیسے موکل کے معزول کرنے سے وکیل معزول ہوجاتا ہے شرکت میں بھی کوئی ایک شریک یک طرفہ معاملہ ختم کردے تو وہ عقد فسخ ہوجاتا ہے البتہ اس

---

(۱) والثاني كما في سفل انهدم، فإن صاحبه لا يجبر على البناء على ما مر، فذو العلو مضطر إلى البناء وصاحبه لا يجبر، فإذا أنفق ذو العلو لا يكون متبرعا، ومثله الحائط المنهدم إذا كان عليه حمولة الآخر على ما يأتي بيانه. (شامي: ۶/ ۵۱۲)

(۲) بخلاف ما إذا كان مريد الإنفاق غير مضطر وكان صاحبه لا يجبر كدار يمكن قسمتها وامتنع الشريك من العمارة فإنه لا يجبر، فلو أنفق عليها الآخر بلا إذنه فهو متبرع، لأنه غير مضطر إذ يمكنه أن يقسم حصته ويعمرها كما صرح به في الخانية. (شامي: ۶/ ۵۱۲، زكريا)

(۳) وجميع ما يخرج به الوكيل عن الوكالة يبطل به عقد الشركة (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۰۶)

صورت میں فسخ کے لئے دوسرے شریک کو اس فسخ کا علم ہونا ضروری ہے اس سے پہلے فسخ درست نہ ہوگا جیسا کہ وکیل کو جب تک معزولی کا علم نہیں ہوتا ہے وہ معزول نہیں ہوتا ہے اور اس کا تصرف صحیح رہتا ہے۔

اسی طرح شرکاء میں سے کسی ایک کی موت ہو جائے یا پاگل ہو جائے یا نعوذ باللہ مرتد ہو کر دار الاسلام سے دار الحرب میں چلا جائے تو ان صورتوں میں جس طرح وکالت ختم ہو جاتی ہے شرکت بھی باقی نہ رہے گی خواہ دوسرے شریک کو اس بات کا علم ہو یا نہ ہو جیسا کہ وکیل کو اس کا علم ضروری نہیں۔ (۱)

نوٹ: شرکت کی اقسام واحکام کے متعلق ایک مفید شجرہ کتاب کے اخیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

(۱) (وإذا مات أحد الشريكين أو ارتد ولحق بدار الحرب) وحكم بلحاقه: لأنه بمنزلة الموت (بطلت الشركة) لأنها تتضمن الوكالة، ولابد منها لتحقق الشركة، والوكالة تبطل بالموت وكذا بالالتحاق مرتداً، وإذا بطلت الوكالة بطلت الشركة، ولا فرق بين ما إذا علم الشريك بموته وردته أو لم يعلم; لأنه عزل حكمي، بخلاف ما إذا فسخ أحد الشريكين الشركة حيث يتوقف على علم الآخر، لأنه عزل قصدي. قيدنا بالحكم بلحاقه لأنه إذا رجع مسلماً قبل أن يقضي بلحاقه لم تبطل الشركة. (اللباب في شرح الكتاب: ۲/۱۳۰ شاملة، بدائع الصنائع: ۵/۱۰۶ زکریا) لیکن ان سب صورتوں میں دوسرے شرکاء کی شراکت باقی رہے گی پس اگر متوفی یا مرتد کے ورثہ یا پاگل کا ولی شرکت کو جاری رکھنا چاہیں تو ان کو اس عقد کی تجدید کرنی ہوگی۔ فلو كانوا ثلاثة فمات أحدهم حتى انفسخت في حقه لا تنفسخ في حق الباقين. بحر عن الظهيرية. (شامی: ۶/۵۰۴ زکریا)

کتاب المزارعة

تمہید: مزارعت زرع سے مشتق ہے جس کا معنی ہیں کھیتی کرنا، اور اصطلاح میں مزارعت کہا جاتا ہے پیداوار کے کچھ حصے پر شرعاً معین شدہ شرائط کے ساتھ بٹائی کا معاملہ کرنا۔ یہ عقد مزارعت امام اعظم ابوحنیفہؒ نزدیک جائز نہیں ہے یہی مذہب امام شافعیؒ کا ہے جبکہ صاحبینؒ (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے نزدیک جائز ہے اور بوجہ تعامل اور حاجت کے احناف کے یہاں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ (۱)

۵۲۶- **ضابطہ**: مزارعت میں مالک اور مزارع دونوں کے لئے پیداوار میں سے حصہ شائع کا مقرر کرنا ضروری ہے۔

تشریح: حصہ شائع: یعنی نصف، تہائی، چوتھائی وغیرہ، اگر معین وزن یا کیل کی مقدار طے کی گئی مثلاً مالک زمین کے لئے پیداوار کا پچاس من ہوگا باقی مزارع کا ہوگا یا مزارع کے لئے پیداوار کا دس من ہوگا تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ ممکن ہے پیداوار اتنی ہی ہو تو پہلی صورت میں مزارع اور دوسری صورت میں مالک کو کچھ نہیں ملے گا۔

مزارع کے لئے پیداوار کے علاوہ کوئی اور چیز دینا طے کیا گیا مثلاً گیہوں بوئے اور چاول دینا طے کیا گیا یا حاصل شدہ گیہوں کی بجائے بازار سے گیہوں خرید کر دینا طے کیا گیا تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ پھر یہ مزارعت نہ رہے گی مزارعت میں مزارع کے لئے پیداوار میں سے ہی کچھ حصہ بطور اجرت دینا ضروری ہے، تا کہ اجارۂ مطلقہ سے یہ الگ رہے۔ (۲)

---

(۱) (مستفاد: بدائع، ہدایہ، اللباب، البحر، شامی)

(۲) يشترط حين العقد تعيين حصة الزارع من الحاصلات جزءا شائعا ←

۵۲۷-**ضابطہ:** مزارعت میں ہر وہ کام جو کھیتی کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے وہ مزارع کے ذمہ ہے۔

جیسے سینچائی کرنا، جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا، دوائی چھڑکنا وغیرہ سب مزارع کے ذمہ ہے کیونکہ یہ عقد کا مقتضاء ہے یعنی نفس عقد اس کو شامل ہوتا ہے اگرچہ بوقت عقد ان کو بیان نہ کیا گیا ہو۔ (۱)

۵۲۸-**ضابطہ:** مزارعت میں (بیج اور آلۂ کاشت کے علاوہ) کھیتی سے متعلق تمام اخراجات میں فریقین اپنے حصہ کے تناسب سے شریک ہوں گے۔

تشریح: پس کھاد ڈالنے، خودرو پودوں کو اکھاڑنے، کٹائی کرنے، بار برداری کرنے اور گاہنے وغیرہ کے اخراجات دونوں پر ان کے حصوں کے تناسب سے عائد ہوں گے (مگر یہ کہ بوقت عقد کسی ایک کے لئے اس کی شرط لگائی جائے اور وہ منظور بھی کرلے تو پھر اسی پر یہ اخراجات لازم ہوں گے) (۲)

→ كالنصف والثلث فإذا لم تتعين حصته أو تعينت على إعطائه شيئا من غير الحاصلات أو قطعت على مقدار كذا كيلة من الحاصلات فالمزارعة غير صحيحة. (مجلة الأحكام العدلية: ١/ ٢٧٧، شاملة) (ومنها): أن تكون حصة كل واحد من المزارعين بعض الخارج حتى لو شرطا أن يكون من غيره لا يصح العقد لأن المزارعة استئجار ببعض الخارج به تنفصل عن الإجارة المطلقة (بدائع: ٥/ ٢٥٨، زكريا)

---

(١) ان كل ما كان من عمل المزارعة مما يحتاج إليه لإصلاحه فعلى المزارع؛ لأن العقد تناوله وقد بيناه. (بدائع: ٥/ ٢٦٣، زكريا)

(٢) ان كل ما كان من باب النفقة على الزرع من السرقين وقلع الحشاوة، ونحو ذلك فعليهما على قدر حقهما، وكذلك الحصاد والحمل إلى البيدر والدياس وتذريته، لما ذكرنا أن ذلك ليس من عمل المزارعة حتى يختص به المزارع. (بدائع: ٥/ ٢٦٣، زكريا)

۵۲۹-**ضابطہ**: مزارعت فاسدہ میں تمام پیداوار اس کی ہوگی جس کا بیج ہے اور دوسرا ساتھی اگر مالک زمین ہے تو اس کے لئے زمین کا کرایہ ہوگا اور اگر مزارع ہے تو اس کے لئے اس کی محنت کی اجرت مثل ہوگی۔ (۱)

تشریح: مزارعت فاسدہ جیسے پیداوار میں حصہ بجائے فیصد مقرر کرنے کے وزن یا پیمانہ کی قطعی مقدار سے متعین کیا گیا؛ یا حصہ میں جہالت رکھی؛ یا کیا بوئے گا اس کی وضاحت نہیں کی اور کلی اختیار بھی نہیں دیا؛ یا جیسے زمین مالک پر عمل کی شرط لگائی گئی؛ یا ساری پیداوار ایک کے لئے ہونا طے کیا گیا؛ تو ان سب صورتوں میں مزارعت فاسد ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ ساری پیداوار بیج والے کی ہوگی اور دوسرا فریق اگر مالک زمین ہے تو وہ زمین کے کرایہ کا اور مزارع ہے تو اجرت مثل کا مستحق ہوگا۔

پھر مذکور صورت میں ساری پیداوار کا مستحق اگر مالک زمین بنتا ہے تو وہ سب اس کے لئے حلال ہے کیونکہ بیج بھی اسی کا ہے اور زمین بھی اسی کی، لیکن اگر مزارع مستحق ہوتا ہے تو اس کے لئے وہ پیداوار اس قدر ہی حلال ہوگی جتنا اس کا بیج اور دوسری لاگت لگی ہے اس سے زائد پیداوار کا صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا۔ (۲)

فائدہ: اگر کسی ایک فریق کا انتقال ہو جائے تو اصولاً یہ عقد ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ مزارعت ایک طرح کا اجارہ ہے اور اجارہ کسی ایک فریق کی موت پر ختم ہو جاتا

---

(۱) تكون جميع الحاصلات في المزارعة الفاسدة لصاحب البذر فإذا كان الآخر صاحب الأرض فيأخذ أجرة أرضه وإذا كان الزارع فيأخذ أجر المثل. (مجلة الأحكام العدلية: ۱/۲۷۷)

(۲) ويطيب الخارج كله لرب البذر إن كانت الأرض له لأنه نماء بذره وخراج أرضه وإن لم تكن الأرض لصاحب البذر تصدق بما زاد على البذر والمؤن كذا في البرهان (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۲/۳۲۶، شاملة تحفة الفقهاء: ۳/۲۶۵، شاملة)

ہے لیکن یہاں فتویٰ اس پر ہے کہ اگر پودا اگ چکا ہے تو کھیت تیار ہونے تک یہ عقد باقی رہے گا۔ (۱)

نوٹ: مزارعت کے ارکان چار ہیں: زمین، عمل، بیج، آلۂ کاشت اس لحاظ سے مزارعت کی مختلف اقسام ہو جاتی ہیں آسانی کے لئے ان اقسام اور ان کے احکام کو شجرہ میں بیان کیا گیا ہے جو کتاب کے اخیر میں ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب الأیمان

۵۳۰-ضابطہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی قسم کھانا جائز نہیں۔

تشریح: پس کسی پیغمبر یا بزرگ یا ماں باپ واولاد یا زندگی اور موت یا کسی متبرک چیز مثلاً مسجد، کعبہ یا زم زم وغیرہ کی قسم کھانا جائز نہیں یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور بالاتفاق ایسی قسمیں معتبر نہیں۔ (۲)

پس ضروری ہے کہ قسم صرف اللہ کے اسم ذات سے ہو یا اللہ کی صفات سے ہو لیکن اللہ کی صفات سے قسم کے متعلق تفصیل ہے بعض صفات اللہ تعالیٰ کی ایسی ہیں کہ غیر اللہ میں ان کا استعمال غالب ہیں اس لئے ان سے قسم منعقد نہیں ہوتی ہے جیسے کہا اللہ کے علم کی قسم، اللہ کی رحمت، غضب، یا کلام کی قسم تو اس سے یمین منعقد نہ ہوگی لیکن

(۱) قال - رحمه الله -: (وتبطل بموت أحدهما) لأنها إجارة وهي تبطل بموت أحد المتعاقدين إذا عقدها لنفسه وقد بيناه في الإجارة وهذا الإطلاق جواب القياس، وفي الاستحسان إذا مات وقد نبت الزرع يبقى عقد الإجارة حتى يحصد الزرع (البحر الرائق: ۱۸۵/۸ فصل: تبطل المزارعة بموت احدهما، شاملة)

(۲) لا ينعقد القسم بغيره تعالى أي غير أسمائه وصفاته ولو بطريق الكناية كما مر، بل يحرم كما في القهستاني (شامی: ۱۲/۳، ۷، شاملہ)

بعض مشائخ سے اس سلسلہ میں یہ اصول منقول ہے کہ: ان میں اصل حیثیت عرف کی ہے عرف میں جس تعبیر اور جس صفت سے قسم مراد لی جاتی ہو ان سے قسم ہو جائے گی اور جن کے متعلق عرف ایسا نہ ہو ان سے قسم نہیں ہوگی۔ (۱)

پس قرآن مجید کہ وہ کلام الٰہی ہے اور اس سے قسم کھانا اب متعارف ہو گیا ہے اس لئے وہ معتبر ہے اور قسم ہو جائے گی (لیکن قسم کا لفظ بولے بغیر محض قرآن پر ہاتھ رکھنے سے قسم نہ ہوگی) (۲)

استدراک: اور یہ سوال کہ جب غیر اللہ کی قسم جائز نہیں تو پھر قرآن مجید میں غیر اللہ کی قسم کیوں ہے؟ تو اس کی مختلف توجیہات ہیں:

(۱) احکام شرعیہ مکلفین کے لئے ہیں اللہ تعالیٰ احکام کے مکلف نہیں، لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْ نَ۔

(۲) ایسے مواضع میں مضاف لفظ "رب" ہے پس و الغدایت اصل میں و رَبِّ الغدیٰتِ ہے۔

(۳) کبھی قسم سے مقسم بہ کی تعظیم مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی کسی عجیب حالت کا بیان اور اس سے استشہاد مقصود ہوتا ہے، مخلوق کی قسم اس صورت میں ناجائز ہے جبکہ اس کی تعظیم مقصود ہو۔

(۴) کبھی قسم سے صرف تزیین کلام مقصود ہوتا ہے قسم مقصود نہیں ہوتی، کما قالوا

---

(۱) والحاصل أن الحلف بالصفة سواء كانت صفة ذات أو صفة فعل إن تعورف الحلف بها فيمين وإلا فلا، لأن الأيمان مبنية على العرف (اللباب في شرح الكتاب: ۵/۴) وعن مشايخنا من قال ما تعارفه الناس يمينا يكون يمينا إلا ما ورد الشرع بالنهي عنه و ما لم يتعارفوه يمينا لا يكون يمينا (بدائع: ۶/۳ شاملة)

(۲) وفي فتح القدير: ثم لا يخفى أن الحلف بالقران الان متعارف فيكون يمينا كما هو قول الأئمة الثلاثة (البحر الرائق: ۳۱۱/۴، شاملہ)

فی قولھم "ولعمری"۔ (۱)

فائدہ: مطلق قسم کھائی یعنی کہا: "قسم ہے" یا "قسم کھاتا ہوں" ، اور یہ نہیں کہا: "اللہ کی قسم" یا "رحمٰن کی قسم" تب بھی قسم ہوجائے گی، کیونکہ قسم اللہ ہی کی مشروع ہے اوراس کے علاوہ کی ممنوع ہے لہذا مطلق قسم بولنے پر اللہ ہی کی قسم مراد ہوگی۔

اسی طرح اگر کہا "خدا گواہ ہے" یا "خدا شاہد ہے" تو بھی قسم ہوجائے گی، کیونکہ ان الفاظ سے قسم متعارف ہے، چنانچہ قرآن مجید میں منافقین کی اس طرح کی شہادت کو قسم پر محمول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: [وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ] (البقرۃ:۲۰۴) وفی مقام آخر: {قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ} [المنافقون:۱] ثم قال {اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً} [المنافقون:۲] (۲)

۵۳۱- **ضابطہ:** قسم میں ہر جگہ کے عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ (۳)

تفریعات:

(۱) چنانچہ اگر قسم کھائی کہ گوشت نہیں کھائے گا تو مچھلی کھانے سے حانث نہ ہوگا لیکن اگر وہ ایسے علاقہ کا ہو جہاں لوگ مچھلی کو بھی گوشت بولتے ہو جیسے خوارزم کا علاقہ تو

---

(۱) (ھذا بحث الاستدراک کلہ ماخوذ من احسن الفتاوی: ۵/ ۴۹۴، دارالاشاعت دیوبند)

(۲) والشھادۃ یمین قال اللہ تعالی {قالوا نشھد إنك لرسول اللہ} [المنافقون:۱] ثم قال {اتخذوا أیمانھم جنۃ} [المنافقون:۲] والحلف باللہ ھو المعھود المشروع وبغیرہ محظور فیصرف إلیہ وأشار إلی أنہ لو قال: حلفت، أو أقسمت، أو شھدت باللہ، أو لم یقل باللہ (البحر الرائق: ۴/ ۳۰۷، شاملہ)

(۳) وفي الأیمان یعتبر العرف في کل موضع (شامی: ۵/ ۵۷۰، زکریا- البحر الرائق: ۴/ ۳۸۴، شاملہ)

مچھلی کھانے سے حانث ہوجائے گا۔ [1]

(۲) اسی طرح قسم کھائی کہ روٹی نہیں کھائے گا تو چاول کی روٹی کھانے سے حانث نہ ہوگا لیکن اگر وہ ایسی جگہ کا رہنے والا ہو جہاں چاول کی روٹی کھائی جاتی ہو جیسے طبرستان میں تو چاول کی روٹی کھانے سے حانث ہوجائے گا۔ [2]

(۳) قسم کھائی کہ پھل نہیں کھائے گا تو ٹماٹر کھانے سے حانث نہ ہوگا لیکن اگر وہ ایسے علاقہ کا باشندہ ہو جہاں ٹماٹر کو پھلوں میں شمار کیا جاتا ہو اور بطور تفکہ لوگ کھاتے ہو جیسے یورپ کے بعض ممالک میں تو ٹماٹر کھانے سے حانث ہوجائے گا۔ [3]

۵۳۲- **ضابطہ:** قسم کا مدار الفاظ عرفیہ پر ہوتا ہے نہ کہ اغراض ومقاصد پر۔ [4]

تفریعات:

(۱) چنانچہ اگر قسم کھائی کہ گھر کے دروازے سے نہیں نکلے گا پھر اس کی کھڑکی یا چھت سے نکلا تو حانث نہیں ہوگا چاہے اس کی مراد اس کلام سے گھر میں قرار پکڑنا ہو اور

(۱) وفي البحر عن المحيط وفي الأيمان يعتبر العرف في كل موضع حتى قالوا لو كان الحالف خوارزميا فأكل لحم السمك يحنث لأنه يسمونه لحما. (شامی: ۵/۵۷۰، زکریا- البحر الرائق: ۴/۳۸۴، شاملہ)

(۲) ولوحلف لا يشتري خبزا فاشترى خبز الأرز لا يحنث إلا أن يكون بطبرستان. (البحر الرائق: ۴/۳۸۴، شاملہ)

(۳) (مستفاد الدر المختار على هامش ردالمحتار: ۵/۵۷۶)

(۴) الأيمان مبنية على الألفاظ لاعلى الاغراض (الدرالمختار على هامش ردالمحتار: ۵/۵۲۸- قواعد الفقه، ص: ۶۵، قاعده: ۶۰، الأشباه والنظائر: ۱۵۵، دار الكتاب بيروت لبنان) (قوله الأيمان مبنية على الألفاظ إلخ) أي الألفاظ العرفية بقرينة ماقبله (شامی: ۵/۵۲۸، زکریا)

کسی طرح سے خواہ دروازہ سے یا چھت سے یا کھڑکی وغیرہ سے باہر نہ نکلنا ہو اس لیے کہ اعتبار الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ مقصود کا۔ (۱)

(۲) قسم کھائی کہ اس شخص کو کوڑے سے نہیں مارے گا پھر اس کو عصا سے مارا تو حانث نہیں ہوگا اگر چہ اس کا مقصود اس کلام سے یہ ہو کہ میں اس کو تکلیف نہیں دوں گا کیونکہ کلام میں لفظ ''کوڑا'' ذکر کیا ہے لہٰذا اسی کا اعتبار ہوگا مقصد اور نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ (۲)

(۳) قسم کھائی کہ ایک ہزار روپے کا کھانا کھائے گا پھر ایک ہزار کی محض ایک روٹی خریدی اور اس کو کھایا تو حانث نہیں ہوگا اگر چہ اس کی مراد اس سے یہ ہو کہ ایسے چیز کھائے گا جو بہت قیمتی ہو کیونکہ معتبر بیان کردہ الفاظ ہوتے ہیں نہ کہ مراد ومقصد اور الفاظ میں ایک ہزار کا کھانا کہا تھا اور اس نے اس پر عمل کرلیا ہے۔ (۳)

فائدہ: ضابطہ میں ''الفاظ عرفیہ'' کی قید سے لغت اور عرف قرآن سے احتراز ہوگیا چنانچہ اگر کوئی قسم کھائے کہ دابہ پر سوار نہیں ہوگا اور وہ کسی انسان پر سوار ہوا تو حانث نہیں ہوگا کیونکہ انسان پر دابہ کا اطلاق لغت کے لحاظ سے ہے عرف عام میں نہیں ہے، اسی طرح اگر قسم کھائی کہ میخ پر نہیں بیٹھے گا اور وہ پہاڑ پر بیٹھے یا قسم کھائی فرش پر نہیں بیٹھے گا اور زمین پر بیٹھے تو حانث نہیں ہوگا کیونکہ پہاڑ کو میخ اور زمین کو فرش

(۱) وكذا لو حلف لا يخرج من الباب، فخرج من السطح لا يحنث، وإن كان الغرض عرفا القرار في الدار وعدم الخروج من السطح أو الطاق أو غيرهما، ولكن ذلك غير المسمى ولا يحنث بالغرض بلا مسمى (شامی:۵/۵۲۹،زکریا)

(۲) وكذا لا يضربه سوطا فضربه بعصا لأن العصا غير مذكورة، وإن كان الغرض لا يؤلمه بأن لا يضربه بعصا ولا غيرها (شامی:۵/۵۲۹،زکریا)

(۳) وكذا ليغدينه بألف فاشترى رغيفا بألف وغداه به لم يحنث وإن كان الغرض أن يغديه بما له قيمة وافية (شامی:۵/۵۲۹،زکریا)

کہنا عرف قرآن ہے عرف عام نہیں ہے۔[۱]

استدراک : لیکن ضابطہ میں غرض اور نیت کے معتبر نہ ہونے سے مراد وہ نیت ہے جو لفظ کے محتمل سے زائد ہو یعنی اس میں لفظ کے عرفی معنی سے صرف نظر کر کے ایک ایسے زائد معنی کی نیت کی جائے جس کا لفظ احتمال نہ رکھتا ہو جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے البتہ اگر لفظ مسمی کے تحت وہ نیت آتی ہو اور لفظ کے عرفی معنی سے تجاوز کرنا نہ ہوتا ہو تو پھر اس نیت کا اعتبار ہوگا چنانچہ قواعد الفقہ میں جہاں مذکور قاعدہ بیان کیا گیا ہے ساتھ میں یہ قاعدہ بھی مذکور ہے کہ: ''قسم میں کسی عام لفظ کو نیت سے خاص کرنا دیانتاً مقبول ہے'' جیسے کہے قسم بخدا میں کھانا نہیں کھاؤں گا پھر کہے میری مراد اس سے فلاں کھانا ہے نہ کہ دوسرا۔ یا کہے جس عورت سے میں نکاح کروں اس کو طلاق اور کہے میری نیت اس سے فلاں شہر کی عورت ہے نہ کے ہر شہر کی عورت تو دیانتاً اس کی یہ نیت معتبر ہوگی، کیونکہ اس نے اپنے کلام میں ایک عام لفظ استعمال کیا ہے اور نیت کے ذریعہ ایک ایسی چیز کی تخصیص کی ہے جس کا وہ لفظ احتمال رکھتا ہے، لہٰذا دیانتاً اس کی یہ نیت معتبر ہوگی۔[۲]

---

(۱)واحترز به عن القول ببنائها على عرف اللغة أو عرف القرآن ففي حلفه لا يركب دابة ولا يجلس على وتد، لا يحنث بركوبه إنسانا وجلوسه على جبل وإن كان الأول في عرف اللغة دابة، والثاني في القرآن وتدا (شامی:۵/۵۲۸،زکریا)

(۲)فظهر أن مرادنا بانصراف الكلام إلى العرف إذا لم تكن له نية، وإن كان له نية شيء واللفظ يحتمله انعقد اليمين باعتباره......فصار الحاصل أن المعتبر إنما هو اللفظ العرفي المسمى، وأما غرض الحالف فإن كان مدلول اللفظ المسمى اعتبر وإن كان زائدا على اللفظ فلا يعتبر (شامی:۵/۵۲۸)تخصيص العام بالنية في الأيمان مقبول ديانة۔ (قواعد الفقہ ،ص:۶۹، قاعدہ:۷۹)(نية تخصيص العام تصح ديانة) إجماعا، فلو قال: كل امرأة أتزوجها فهي طالق ثم قال: نويت ←

اسی طرح لفظ کے معتبر ہونے سے مراد وہ لفظ ہے جو اپنی حقیقت میں مستعمل ہو عرف میں اس کو دوسرے معنی سے مجاز نہ کیا گیا ہو، اگر لفظ سے اس کا مجازی معنی مراد ہو جیسے کہے فلاں کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا تو عرف میں یہ مطلقاً دخول سے مجاز ہے، تو اب اس میں لفظ کا اعتبار نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ گھر سے باہر بیٹھ کر یا لیٹ کر اپنے قدم گھر میں رکھے یا کھڑا کھڑا صرف ایک قدم رکھے اور داخل نہ ہو تو حانث نہیں ہوگا کیونکہ لفظ کا حقیقی معنی (قدم رکھنا) یہاں متروک ہے اور دوسرا مجازی معنی (داخل ہونا) مراد ہے۔[1]

اور اگر لفظ اپنی حقیقت اور مجاز دونوں میں مستعمل ہو تو فقہاء نے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ:

۵۲۳- **ضابطہ**: جب کسی چیز کی حقیقت بھی مستعمل ہو اور مجاز بھی متعارف ہو تو قسم میں اعتبار حقیقت کا ہوگا۔[2]

تفریعات:

(۱) پس اگر کہا میں یہ گیہوں نہیں کھاؤں گا پھر اس کی روٹی کھائی تو حانث نہ ہوگا، کیونکہ گیہوں کو چبا کر کھانا یہ حقیقت ہے اور اس کی روٹی کھانا مجاز ہے اور یہاں مجاز اگرچہ متعارف ہے لیکن حقیقت بھی مستعمل ہے کیونکہ گیہوں کو بھون کر، یا ابال کر کھایا

← من بلد کذا (لا) یصدق (قضاء)۔۔۔۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۵/ ۵۸۴)

(۱) ثم اعلم أن هذا كله حيث لم يجعل اللفظ في العرف مجازا عن معنى آخر كما في: لا أضع قدمي في دار فلان فإنه صار مجازا عن الدخول مطلقا كما سيأتي ففي هذا لا يعتبر اللفظ أصلا حتى لو وضع قدمه ولم يدخل لا يحنث لأن اللفظ هجر وصار المراد به معنى آخر (شامی: ۵/ ۵۳۰، زکریا)

(۲) اليمين اذا كانت لها حقيقة مستعملة ومجاز متعارف فالعبرة للحقيقة۔ (قواعد الفقہ ص: ۱۳۴، قاعدہ: ۴۲۴)

جاتا ہے اس لئے اعتبار حقیقت کا ہوگا پس کچے، بھونے ہوئے یا ابلے ہوئے گیہوں کھانے سے حانث ہوجائے گا اور اس کی روٹی کھانے سے جو کہ مجاز متعارف ہے حانث نہ ہوگا، یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک دونوں ہی صورتوں میں وہ حانث ہوجائے گا یعنی گیہوں چبا کر کھانے سے بھی اور اس کی روٹی کھانے سے بھی بوجہ عموم مجاز کے۔ (۱)

(۲) اسی طرح اگر کسی نے بطور قسم کہا کہ "مجھ پر فلاں کے گھر کا پانی حرام ہے" تو اس میں صرف پانی کی حرمت یہ حقیقت ہے، اور اس سے ہر قسم کا کھانا وغیرہ مراد ہونا یہ مجاز متعارف ہے، پس عند الامامؒ حقیقت پر عمل کیا جائے گا اور صرف پانی پینے سے حانث ہوگا دیگر چیزوں کے کھانے پینے یا استعمال سے حانث نہ ہوگا، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک عموم مجاز پر عمل کیا جائے گا، فتویٰ امام صاحبؒ کے قول پر ہے۔ (۲)

۵۳۴- **ضابطہ**: جس بات پر قسم کھائی جائے ضروری ہے کہ اس کا پورا کرنا فی نفسہ ممکن ہو، اگرچہ عادتاً محال ہو۔ (۳)

---

(۱) ومن حلف لا يأكل من هذه الحنطة لم يحنث حتى يقضمها ولو أكل من خبزها لميحنث عند أبي حنيفة رحمه الله وقالا إن أكل من خبزها حنث أيضا " لأنه مفهوم منه عرفا ولأبي حنيفة رحمه الله أن له حقيقة مستعملة فإنها تقلى وتغلى وتؤكل قضما وهي قاضية على المجاز المتعارف على ما هو الأصل عنده ولو قضمها حنث عندهما هو الصحيح لعموم المجاز كما إذا حلف لا يضع قدمه في دار فلان وإليه الإشارة بقوله في الخبز حنث أيضا (ہدایہ: ۲/ ۳۲۶، مکتبہ شاملہ)

(۲) (احسن الفتاویٰ: ۵/ ۴۹۳، دار الاشاعت)

(۳) (وأما) الذي يرجع إلى المحلوف عليه فهو أن يكون متصور الوجود حقيقة عند الحلف هو شرط انعقاد اليمين على أمر في المستقبل ..... قال أصحابنا الثلاثة: ليس بشرط فينعقد على ما يستحيل وجوده عادة بعد أن كان لا يستحيل وجوده حقيقة. (بدائع الصنائع: ۳/ ۱۱، شاملہ)

تفریعات:

(۱) پس اگر قسم کھائی کہ اس گلاس میں موجود پانی پیونگا جبکہ اس میں پانی نہیں ہے اور اس کو پہلے سے علم بھی نہیں تھا کہ پانی نہیں ہے تو قسم معتبر نہ ہوگی۔[1]

(۲) اسی طرح قسم کھائی کہ فلاں شخص کو قتل کروں گا جبکہ وہ شخص مرچکا ہے اور یہ اس کی موت سے واقف نہیں تھا تو قسم کا اعتبار نہ ہوگا —— (لیکن اگر پہلے سے جانتا ہو کہ گلاس میں پانی نہیں ہے یا فلاں شخص فوت ہوچکا ہے تو پھر قسم منعقد ہوجائے گی کیونکہ جب جانتا ہے تو اب قسم کا تعلق اس دوسرے پانی سے ہوگا جو فی الحال نہیں ہے اسی طرح میت کی دوسری زندگی سے ہوگا، اور دوسرے پانی اور دوسری زندگی کا وجود فی نفسہ ممکن ہے گو عادتاً محال ہے، برخلاف جبکہ پہلے سے واقف نہ ہو کیونکہ اس وقت قسم کا تعلق فی الحال موجود گلاس میں پانی سے ہوگا اسی طرح دوسرے مسئلہ میں انسان کی پہلی زندگی سے ہوگا اور وہی پانی اور وہی زندگی واقع میں موجود نہیں ہے اور نہ متصور الوجود ہے لہٰذا اس صورت میں قسم کا اعتبار نہ ہوگا)[2]

(۳) اور اگر قسم کھائی کہ میں آسمان پر چڑھوں گا یا آسمان کو چھوؤں گا تو یہ قسم معتبر ہوگی۔

(۴) اسی طرح قسم کھائی کہ میں اس پتھر کو سونے میں تبدیل کردوں گا تو قسم منعقد ہوجائے گی —— کیونکہ آسمان کا چھونا اور پتھر کو سونے میں بدلنا گو عادتاً محال ہے لیکن فی نفسہ ممکن ہے۔ پس اس صورت میں موت سے پہلے پہلے قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔[3]

(۱-۲-۳) وأما كونه متصور الوجود عادة فهل هو شرط انعقاد اليمين؟. قال أصحابنا الثلاثة: ليس بشرط فينعقد على ما يستحيل وجوده عادة بعد أن كان لا يستحيل وجوده حقيقة. وقال زفر: هو شرط لا تنعقد اليمين بدونه وبيان هذه الجملة إذا قال: والله لأشربن الماء الذي في هذا الكوز فإذا لا ماء فيه لم تنعقد اليمين في قول أبي حنيفة ومحمد وزفر لعدم شرط الانعقاد وهو تصور ←

۵۳۵-ضابطہ بفعل غیر پر قسم جائز نہیں۔

تشریح: یعنی غیر کے فعل پر یہ قسم کھانا کہ اس نے یہ کام نہیں کیا ہے تو یہ جائز نہیں، جیسے زید پر قسم آئے لیکن اس پر اطمینان نہ ہو اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی طرف سے اس کے والد یا بھائی قسم اٹھائے اور کہے کہ زید نے یہ کام نہیں کیا تو یہ جائز نہیں، کیونکہ قسم قطعی اور یقینی بات پر ہوتی ہے اور غیر کے فعل کے متعلق یقینی علم نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کے فعل پر قسم جائز نہیں۔

← شرب الماء الذي حلف عليه وعند أبي يوسف تنعقد لوجود الشرط وهو الإضافة إلى أمر في المستقبل وإن كان يعلم أنه لا ماء فيه تنعقد عند أصحابنا الثلاثة وعند زفر لا تنعقد وهو رواية عن أبي حنيفة أنه لا تنعقد علم أو لم يعلم وعلى هذا الخلاف إذا وقت وقال والله لأشربن الماء الذي في هذا الكوز اليوم ولا ماء في الكوز أنه لا تنعقد عند أبي حنيفة ومحمد وزفر وعند أبي يوسف تنعقد وعلى هذا الخلاف إذا قال والله لأقتلن فلانا وفلان ميت وهو لا يعلم بموته أنه لا تنعقد عندهم خلافا لأبي يوسف وإن كان عالما بموته تنعقد عندهم خلافا لزفر. ولو قال والله لأمسن السماء أو لأصعدن السماء أو لأحولن هذا الحجر ذهبا تنعقد عند أصحابنا الثلاثة..... والدليل على أن البر غير متصور الوجود من هذه اليمين حقيقة أنه إذا كان عنده أن في الكوز ماء وأن الشخص حي فيمينه تقع على الماء الذي كان فيه وقت اليمين وعلى إزالة حياة قائمة وقت اليمين والله تعالى وإن كان قادرا على خلق الماء في الكوز ولكن هذا المخلوق لا يكون ذلك الماء الذي وقعت يمينه عليه وفي مسألة القتل زالت تلك الحياة على وجه لا يتصور عودها بخلاف ما إذا كان عالما بذلك؛ لأنه إذا كان عالما به فإنما انعقد يمينه على ماء آخر يخلقه الله - تعالى - وعلى حياة أخرى يحدثها الله تعالى إلا أن ذلك على نقض العادة فكان العجز عن تحقيق البر ثابتا عادة فيحنث. (بدائع الصنائع: ۱۱/۳، شاملة)

البتہ عدم علم کی قسم جائز ہے یعنی یوں کہنا کہ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں تو یہ جائز ہے۔[1]

۵۴۶-**ضابطہ**: اگر قسم کھانے والا مظلوم ہے تو اس کی نیت کا اعتبار ہوگا اور اگر ظالم ہے تو قسم لینے والے کی نیت معتبر ہوگی۔[2]

تشریح: ایک نے دوسرے کو قسم کھلائی خواہ اپنے طور پر یا قاضی کے واسطہ سے لیکن قسم کھانے والا ظاہری معنی چھوڑ کر ایسا غیر متبادر معنی مراد لیتا ہے جو قسم کھلانے والے کے منشاء کے خلاف ہے (لیکن اس لفظ کا محتمل ہے خواہ عرف عام میں یا لغت میں یا اصطلاح قرآن میں) جیسے چھت سے آسمان، فرش سے زمین اور لباس سے رات مراد لیتا ہے یا زید کا نام لیتا ہے اور اس سے کوئی اور اس کا ہم نام شخص مراد لیتا ہے یا اپنی آستین میں مدعی کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر اس کا کوئی حق نہیں تو اس میں اصول یہ ہے کہ اگر قسم کھانے والا مظلوم ہے تو اس کی نیت کا اعتبار ہوگا تاکہ اس کی دادرسی ہو سکے اور اگر ظالم ہے تو مستحلف (قسم کھلانے والے) کی نیت معتبر ہوگی۔[3]

۵۴۷-**ضابطہ**: کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرنا قسم ہے خواہ وہ چیز حلال ہو یا

---

(۱)(التحليف على فعل نفسه يكون على البتات) أي القطع بأنه ليس كذلك (و) التحليف (على فعل غيره) يكون (على العلم) أي إنه لا يعلم أنه كذلك لعدم علمه بما فعل غيره ظاهرا (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۵۵۲/۵، في سبب الدعوى، شاملة۔ درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۳۳۸/۲، في اركان الدعوى، شاملة)

(۲) اليمين على نية الحالف ان كان مظلوما وعلى نية المستحلف ان كان ظالما (قواعد الفقه ص: ۱۴۴، قاعدہ: ۴۲۵)

(۳)(شامیہ: ۵۸۶/۵، زکریا)

(پہلے ہی سے) حرام ہو۔ (۱)

جیسے:

اگر کہا مجھ پر یہ کھانا حرام ہے، یا فلاں کے گھر جانا حرام ہے، یا فلاں سے بات کرنا حرام ہے تو یہ قسم ہے اس کے خلاف کرنے پر قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔

بلکہ اگر کہا آئندہ مجھ پر شراب حرام ہے یا خنزیر کھانا حرام ہے یا سینما دیکھنا حرام ہے تو یہ چیزیں اگر چہ ویسے ہی حرام ہیں لیکن ان کو اپنے اوپر حلفاً حرام کرنے سے قسم ہوجاتی ہے، پس اگر خدانخواستہ آئندہ ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کیا تو گناہ کے علاوہ کفارہ بھی لازم ہوگا [البتہ اگر محض حرمت کی خبر دینا مقصود ہو یعنی شرعاً یہ چیز مجھ پر حرام ہے یہ بتلانا مقصود ہو تو پھر قسم نہ ہوگی] (۲)

اور حلال کو حرام کرنا گو قسم ہے مگر وہ چیز اس پر حرام نہیں ہوتی، قسم کے بعد بھی اس کے لئے اس کا استعمال جائز وحلال ہوتا ہے البتہ اس حرام کردہ چیز کو جب استعمال کرے گا تو کفارۂ قسم لازم ہوگا، بلکہ حکم یہ ہے کہ حلال کو حرام کرنے میں اگر معصیت کی یا کارِ خیر سے باز رہنے کی قسم ہو مثلاً فلاں سے بات کرنا یا اس کی مدد کرنا حرام کیا ہے تو اس میں حانث ہوجائے اور قسم کا کفارہ دیدے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ (۳)

فائدہ: فلاں کام کروں تو اسلام سے بیزار ہوں یا کافر ہوجاؤں تو یہ بھی قسم ہے

---

(۱) (الدر المختار: ۵/ ۵۰۸، مکتبہ زکریا)

(۲) قال في التنوير: ومن حرم شيئا ثم فعله كفر وفي الشرح: ولو حراما أو ملك غيره كقوله الخمر أو مال فلان علي حرام فيمين ما لم يرد الإخبار خانية (الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۵/ ۵۰۸، مکتبہ زکریا)

(۳) فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حلف على يمين، فرأى غيرها خيرا منها، فليأتها، وليكفر عن يمينه (مسلم شریف: حدیث: ۱۶۵۰، شاملہ)

اور اس میں حکم ہے کہ اگر اس کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ اس کلام کے بعد فلاں کام کرنے سے واقعۃً کافر ہو جائے گا اس کے باوجود وہ کام کر لیا تو یہ شخص کافر ہو گیا اور اگر یہ عقیدہ نہیں تھا بلکہ وہ اسے قسم سمجھتا تھا تو کافر نہیں ہوا، اس صورت میں اس پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔ (۱)

کتاب النذر

(منت کا بیان)

۵۳۸- **ضابطہ**: نذر کے انعقاد کے لئے زبان سے تلفظ ضروری ہے محض دل میں نیت سے نذر منعقد نہ ہوگی۔

تشریح: نذر یعنی منت ماننا یہ زبان کا عمل ہے پس اس میں زبان سے صراحتاً تلفظ کرنا کہ میں روزے کی یا نماز کی یا اعتکاف کی یا حج کی یا اتنا مال صدقہ کرنے کی نذر (منت) مانتا ہو یا اس چیز کو اپنے اوپر لازم کرتا ہوں یہ ضروری ہے صرف دل دل میں کسی چیز کو اپنے اوپر لازم کرنے سے نذر کا انعقاد نہیں ہوتا اور اس طرح کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ (۲)

---

(۱) (و) القسم أيضا بقوله (إن فعل كذا فهو) يهودي أو نصراني أو فاشهدوا علي بالنصرانية أو شريك للكفار أو (كافر) فيكفر بحنثه لو في المستقبل، أما الماضي عالما بخلافه فغموس. واختلف في كفره (و) الأصح أن الحالف (لم يكفر) سواء (علقه بماض أو آت) إن كان عنده في اعتقاده أنه (يمين وإن كان) جاهلا. و (عنده أنه يكفر في الحلف) بالغموس وبمباشرة الشرط في المستقبل (يكفر فيهما) لرضاه بالكفر، بخلاف الكافر۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۵/ ۴۹۰، مكتبه زكريا)

(۲) والنذر لا يكون إلا باللسان، ولو نذر بقلبه لا يلزمه بخلاف النية، لأن ←

۵۳۹- **ضابطہ:** صحت نذر کے لئے ضروری ہے کہ منذور بہ عبادت مقصودہ ہو اور اس کے جنس میں سے کوئی فرد واجب ہو، ورنہ نذر منعقد نہ ہوگی۔ (۱)

تفریعات:

(۱) پس اگر کھانے؛ یا پینے؛ یا بیوی سے جماع؛ وغیرہ کی نذر مانی تو یہ نذر منعقد نہ ہوگی کیونکہ ان چیزوں میں عبادت کا وصف نہیں ہے یہ محض مباح ہیں۔ (۲)

(۲) اسی طرح تبلیغ میں جانے؛ یا مریض کے عیادت کرنے؛ یا جنازہ کے پیچھے چلنے؛ یا وضو یا غسل کرنے؛ یا مسجد میں داخل ہونے؛ یا قرآن کو چھونے؛ یا اذان کرنے؛ یا مسجد یا مدرسہ کو تعمیر کرنے؛ یا رفاہ عام کے لئے مسافر خانہ وغیرہ بنانے؛ کی نذر مانی تو ان تمام صورتوں میں بھی نذر منعقد نہ ہوگی، کیونکہ یہ سب چیزیں اگر چہ قربت اور ثواب کی ہیں اور ان میں عبادت کا وصف موجود ہے لیکن وہ عبادت "عبادت مقصودہ" نہیں ہے، لہٰذا ایسی نذر کا ایفاء واجب نہیں، محض جائز ہے۔ (۳)

← النذر عمل اللسان والنية المشروعة انبعاث القلب على شأن أن يكون لله تعالى كذا في البزازية (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۲۱۲/۱؛ شامي: ۲/۴۳۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة، مكتبه شاملة)

---

(۱) (قال في التنوير: ومن نذر نذرا مطلقا أو معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة وجد الشرط لزم الناذر (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۵۱۵/۳، زكريا)

(۲) وكذا النذر بالمباحات من الأكل والشرب والجماع ونحو ذلك لعدم وصف القربة لاستوائهما فعلا وتركا (بدائع الصنائع: ۸۲/۵، شاملہ)

(۳) فلا يصح النذر بعيادة المرضى وتشييع الجنائز والوضوء والاغتسال و دخول المسجد ومس المصحف والأذان وبناء الرباطات والمساجد وغير ذلك وإن كانت قربا، لأنها ليست بقرب مقصودة (بدائع الصنائع: ۸۲/۵، شاملہ)

(۳) اور اگر نماز پڑھنے؛ یا صدقہ کرنے؛ یا قربانی کرنے؛ یا حج یا عمرہ کرنے؛ یا اعتکاف کرنے؛ یا درود شریف پڑھنے؛ وغیرہ کی نذر مانی تو منعقد ہو جائے گی کیونکہ یہ تمام عبادت مقصودہ ہیں اور ان کی جنس میں سے فرض یا واجب موجود ہیں پس ایسی نذر کا ایفاء واجب ہے۔[1]

(۴) اور اگر تسبیح پڑھنے کی نذر مانی تو منعقد نہ ہوگی کیونکہ تسبیح اگرچہ عبادت مقصودہ ہے مگر اس کی جنس میں سے کوئی واجب نہیں ہے ــــ البتہ اگر نماز کے بعد کی تسبیح کی نذر مانی تو نذر منعقد ہو جائے گی اور واجب الاداء ہوگی کیونکہ نماز کے بعد کی تسبیح تغلیباً تحمید وتکبیر کو بھی شامل ہے اور تحمید نماز میں سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں فرض ہے اور تکبیر ابتداء نماز میں فرض ہے۔[2]

استدراک: اگر کسی نے پیدل حج کی نذر مانی تو یہ نذر صحیح ہے اور اس پر لازم ہے کہ حج شروع کرنے کے بعد جب تک طواف زیارت نہ کرلے سوار نہ ہو کیونکہ پیدل حج کرنا بوجہ مشقت کے ثواب میں زیادتی کا موجب ہے تو گویا اس نے صفت کمال کے ساتھ حج کی نذر مانی ہے پس وہ نذر معتبر ہوگی جیسا کہ مسلسل روزے کی نذر مانے تو وہ نذر معتبر ہے یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پیدل چلنے کی یہ نذر کیسے معتبر ہوگی جبکہ صحت نذر کے لئے جہاں منذور بہ کا عبادۃ مقصودۃ ہونا ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی نظیر موجود ہو یعنی اس کے جنس میں سے واجب یا فرض پایا جائے حالانکہ یہاں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے تو جواب یہ ہے کہ یہاں نظیر موجود ہے وہ یہ کہ اہل مکہ اور ان کے ارد گرد لوگوں پر وجوب حج کے لئے راحلہ کی شرط نہیں ہے بلکہ ان

(۱) ویصح النذر بالصلاۃ والصوم والحج والعمرۃ والإحرام بهما والعتق والبدنة والهدي والاعتكاف ونحو ذلك؛ لأنها قرب مقصودة (بدائع الصنائع: ۸۲/۵، شاملہ)

(۲) (احسن الفتاویٰ: ۴۸۱/۵، استنباطاً عن الشامیہ)

میں جو بھی شخص پیدل چلنے پر قادر ہو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے پس جب پیدل چلنا صفت کمال ہے اور اس کی نظیر بھی موجود ہے تو اس کی نذر ماننا معتبر ہوگا۔ پھر اگر ناذر نے سوار ہو کر حج کیا تو نقص کی وجہ سے اس پر کم از کم ایک بکری بطور دم حرم میں ذبح کرنا واجب ہوگا۔ (۱)

فائدہ(۱): مسجد کے بناء کی نذر صحیح نہیں (جیسا کہ گذرا) لیکن وقف للفقراء کے لئے کوئی عمارت وغیرہ کی نذر ماننی تو صحیح ہے کیونکہ مسجد کی بناء عبادت مقصودہ نہیں ہے، اور وقف للفقراء عبادت مقصودہ ہے اور اس کے جنس یعنی وقف میں سے بناء مسجد واجب ہے، پس وقف للفقراء عبادت مقصودہ ہے مگر واجب نہیں اور بناء مسجد واجب ہے مگر عبادت مقصودہ نہیں اور نذر کی صحت کے لئے شرط ہے کہ منذور عبادت مقصودہ ہو اور اس کی جنس میں سے کوئی فرد واجب ہو اور یہ شرط وقف للفقراء میں موجود ہے مگر بناء مسجد میں مفقود ہے لہٰذا وقف مسجد کی نذر صحیح نہیں اور وقف للفقراء کی صحیح ہے۔ (۲)

---

(۱) (ومن أوجب حجا ماشيا لا يركب حتى يطوف للركن) أي من أوجب على نفسه بالنذر أن يحج ماشيا لا يجوز له أن يركب حتى يطوف طواف الركن، وهو طواف الزيارة؛ لأنه التزم الحج على صفة الكمال؛ لأن المشي أشق على البدن فيجب عليه الإيفاء بما التزم كما لو نذر أن يصوم متتابعا ولا يقال: كيف يجب عليه المشي بالنذر وهو من شرطه أن يكون له نظير في الشرع وهذا لا نظير له؛ لأنا نقول: لا بل له نظير؛ لأن أهل مكة ومن حولها لا يشترط في حقهم الراحلة بل يجب المشي على كل من قدر منهم على المشي، ولو ركب أراق دما؛ لأنه أدخل فيه النقص، وكذا إذا ركب في أكثره، وإن ركب الأقل يجب عليه بحسابه من الدم وبطواف الزيارة ينتهي الإحرام فيمشي إليه (تبيين الحقائق: ۲/۹۳ كتاب الحج، شاملة)

(۲) فهذا صريح في أن الشرط كون المنذور نفسه عبادة مقصودة لا ما ←

فائدہ (۲): اگر کسی نے صرف اتنا کہا میں نذر (منت) مانتا ہوں اور اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا اور نہ اس شخص کی کوئی مخصوص نیت ہے تو قسم کا کفارہ (یعنی دس مساکین کو کھانا کھلانا اور اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن مسلسل روزے رکھنا) لازم ہوگا؛ اور اگر مطلق روزوں کی نذر مانی یعنی تعداد کا ذکر نہیں کیا تو تین روزے لازم ہوں گے؛ اور اگر مطلق صدقہ کی نذر مانی تو اطعام عشرۃ مساکین واجب ہوگا یعنی مقدار صدقۃ الفطر سے دس گنا زیادہ یا اس کی قیمت کے برابر نقد روپے یا کوئی دوسری چیز صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ (۱)

۵۴۰- **ضابطہ**: نذر میں زمان، مکان، شیء منذور اور فقیر کی تعیین معتبر نہیں۔ (۲)

تشریح: پس اگر کسی نے نذر مانی کہ جمعہ کے دن مکہ مکرمہ میں فلاں فقیر کو یہ چیز دوں گا پھر اس نے جمعہ کو نہیں دیا بلکہ جمعرات یا سنیچر کو دیا، یا مکہ مکرمہ کے علاوہ کسی اور

← کان من جنسه، ولذا صححوا النذر بالوقف لأن من جنسه واجبا وهو بناء مسجد للمسلمين كما يأتي مع أنك علمت أن بناء المساجد غير مقصود لذاته (شامی: ۵/۵۱۶ زکریا)

(۱) (قال علي نذر ولم يزد عليه ولا نية له فعليه كفارة يمين) ولو نوى صياما بلا عدد لزمه ثلاثة أيام ولو صدقة فإطعام عشرة مساكين كالفطرة، وفي الشامية: (قوله لزمه ثلاثة أيام) لأن إيجاب العبد معتبر بإيجاب الله تعالى، وأدنى ذلك في الصيام ثلاثة أيام في كفارة اليمين بحر عن الولوالجية (قوله ولو صدقة) أي بلا عدد (قوله كالفطرة) أي لكل مسكين نصف صاع بر وكذا لو قال: لله علي إطعام مسكين لزمه نصف صاع بر استحسانا وإن قال: لله علي أن أطعم المساكين على عشرة عند أبي حنيفة فتح۔ (شامی: ۳/۵۲۶ ق ۵۲۴ زکریا)

(۲) (شامی: ۵/۵۲۴، زکریا)

جگہ میں دیا، یا اس فقیر کے سوا کسی اور فقیر کو دیا، یا وہ معین چیز نہیں دی بلکہ اس کے برابر روپے یا کوئی اور چیز دی تو یہ جائز ہے اس کی نذر پوری ہو جائے گی کیونکہ نذر میں ان چیزوں کی تعیین کا اعتبار نہیں، یعنی ناذر پر وہ تعیین لازم نہیں ہوتی۔

اسی طرح اگر نذر مانی کے فلاں مہینے میں روزہ رکھوں گا اور اس نے اس سے پہلے روزہ رکھ لیا یا نذر مانی کہ فلاں سال حج کروں گا اور اس سے پہلے حج کر لیا تو نذر پوری ہو جائے گی۔

البتہ نذر معلق میں شرط کے وجود سے پہلے منذور کا ادا کرنا صحیح نہیں مثلاً کہا میں اس بیماری سے شفایاب ہو گیا تو فلاں سال حج کروں گا تو شفایاب ہونے سے پہلے حج کرنا صحیح نہیں کیونکہ معلق بالشرط شرط کے وجود سے پہلے نہ ہونے کے برابر ہے پس اس میں شرط کے بعد کا زمانہ ایفاء نذر کے لئے متعین ہے البتہ شرط کے بعد تاخیر میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے علاوہ باقی اشیاء یعنی مکان، شیء منذور اور فقیر کی عدم تعیین میں نذر مطلق اور معین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (۱)

---

(۱) والنذر ....لا يختص بزمان ومكان ودرهم وفقير فلو نذر التصدق يوم الجمعة بمكة بهذا الدرهم على فلان فخالف جاز وكذا لو عجل قبله فلو عين شهرا للاعتكاف أو للصوم فعجل قبله عنه صح، وكذا لو نذر أن يحج سنة كذا فحج سنة قبلها صح أو صلاة في يوم كذا فصلاها قبله لأنه تعجيل بعد وجود السبب، وهو النذر فيلغو التعيين بخلاف النذر المعلق، فإنه لا يجوز تعجيله قبل وجود الشرط اهـ قلت: وقدمنا هناك الفرق وهو أن المعلق على شرط لا ينعقد سببا للحال كما تقرر في الأصول بل عند وجود شرطه، فلو جاز تعجيله لزم وقوعه قبل سببه فلا يصح، ويظهر من هذا أن المعلق يتعين فيه الزمان بالنظر إلى التعجيل، أما تأخيره فالظاهر أنه جائز إذ لا محذور فيه، وكذا يظهر منه أنه لا يتعين فيه المكان والدرهم والفقير لأن التعليق إنما أثر في انعقاد السببية فقط، ←

استدراک: یہاں ایک اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ نذر میں جب زمان، مکان اور شیء منذور وغیرہ کی تعیین معتبر نہیں تو پھر قربانی میں فقیر جب کوئی جانور خرید تا ہے تو بحکم نذر ہو کر وہ جانور اس پر متعین کیوں ہوجاتا ہے کہ وہ بدلنا چاہے تو بدل نہیں سکتا؟ تو احسن الفتاوی میں اس کے جواب میں یہ منقول ہے کہ: ''وجہ الفرق یہ معلوم ہوتی ہے کہ نذر تضحیہ میں فعل منذور یعنی ذبح کا اثر حسّی حیوان میں پایا جاتا ہے اور نذر تصدق میں مسمی میں فعل منذور یعنی تصدق کا کوئی اثر حسّی نہیں پایا جاتا'' اھ [1]

۵۴۱- **ضابطہ**: نذر مطلق اور نذر تردد میں منذور بہ کا بعینہ ادا کرنا ضروری ہے کفارہ کافی نہ ہوگا جبکہ نذر لجاج میں کفارہ بھی کافی ہے۔

تشریح: جاننا چاہئے کہ نذر کی اولاً دو قسمیں ہیں: نذر مطلق، اور نذر معلق۔

نذر مطلق وہ نذر ہے: جو کسی شرط پر معلق نہ ہو جیسے کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کے واسطہ ایک سال کے روزے واجب ہیں یا ہزار رکعتیں نوافل واجب ہیں اور اس کو کسی شرط پر معلق نہیں کیا اس کو نذر منجز اور نذر مرسل بھی کہا جاتا ہے۔

اور نذر معلق وہ نذر ہے: جو کسی شرط پر معلق ہو اس کی پھر دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسی شرط پر معلق ہو کہ ناذر اس شرط کے وجود کی امید وتمنا کرتا ہے یعنی جلب منفعت یا دفع مضرت کے قبیل سے کوئی شرط ہو مثلاً کہا اگر اللہ نے میرے مریض کو شفاء دی یا میرے غائب کو لوٹا دیا، یا میرے دشمن کو ماردیا تو میں ایک سال کا روزہ رکھوں گا یا حج

← فلذا امتنع فيه التعجيل، وتعين فيه الوقت أما المكان و الدرهم و الفقير فهي باقية على الأصل من عدم التعيين (شامی: ۵/ ۵۲۴، زكريا) وقال في الدر المختار: (نذر أن يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جاز إن ساوى العشرة) كتصدقه بثمنه. (الدر على الرد: ۵/ ۵۲۵، التاتارخانیہ: ۳/ ۳۶۳ زکریا، حاشية الطحطاوی: ۱/ ۲۶۴)

---

(۱) (احسن الفتاوی: ۵/ ۴۸۳)

کروں گا اس نذر کو "نذر تردد" کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایسی شرط ہو کہ ناذر اس کے وقوع کو نہیں چاہتا ہے مثلاً اس نے غصہ میں کہہ دیا کہ "اگر میں فلاں سے بات کروں تو مجھ پر دس ہزار روپیہ صدقہ" حالانکہ وہ چاہتا ہے کہ اس سے بات کرے، اس نذر کو "نذر لجاج" کہا جاتا ہے۔

ان میں پہلی دو قسموں میں یعنی نذر مطلق اور نذر تردد میں منذور بہ (یعنی جس کی نذر مانی ہو مثلا روزہ وغیرہ) کا بعینہ ادا کرنا ضروری ہے اس میں کوئی کفارہ کافی نہ ہوگا، اور آخری قسم یعنی نذر لجاج میں ناذر کو اختیار ہے کہ وجود شرط کے بعد خواہ منذور بہ کو ادا کرے یا قسم کا کفارہ دے۔[1]

---

(۱) فاذا الرجل على نفسه حجة أو عمرة أو ماأشبهه ذالک مماهو طاعة لله عزوجل وكان النذر مرسلا يلزمه الوفاء بماسمى ولاتنفعه الكفارة بلاخلاف۔ وإن كان النذر معلقاً بالشرط إن كان شرطاً يرجى وجوده كجلب منفعة أو دفع مضرة بأن قال "إن شفى الله مريضي، أورد الله غائبي، أرمات عدوى فعلى صوم سنة "فوجد الشرط لزمه الوفاء بماسمى ولايخرج عن العهدة بالكفارة بلاخلاف أيضاً... وإن كان النذر بشرط لايريد كونه فعليه الوفاء بماسمى في ظاهر الرواية عن أصحابنا وروى عن أبي حنيفة أنه رجع عن هذا القول وقال: فهو بالخيار إن شاء خرج عنه بعين ماسمى وإن شاء خرج عنه بالكفارة وهكذا روى عن محمد ومشائخ بلخ كانوا يفتون بهذا۔ (تاتارخانیہ: ۳/ ۲۶۷، زکریا) وهو على نوعين منجز.... ومعلق بشرط ثم المعلق بالشرط ان كان الشرط مرضيا كان قال ان شفى الله مريضي او قدم غائبي فعلّي ان أصوم يسمى نذر تردد وان كان الشرط مكروها كانّ قال ان كلمت زيدا فعلى ان أحج يسمى نذر لجاج.... واما نذر التردد فلايجزيه الا فعل عين المنذور به لانه إذا أراد وجود الشرط أراد وجود النذر فكان المعلق في معنى المنجز فيندرج في حكمه وهو وجوب الإيفاء وعدم جواز العدول عنه الى الكفارة فصار محمل مايقتضى الإيفاء ←

۵۴۲- **ضابطہ**: نذر معلق میں صیغۂ التزام ضروری نہیں، برخلاف نذر مطلق کے۔[1]

تشریح: جو نذر شرط پر معلق ہو اس میں صیغۂ التزام: مثلاً مجھ پر یہ عبادت لازم ہے یا نذر مانتا ہوں، یا اپنے اوپر فرض یا واجب کرتا ہوں وغیرہ کہنا ضروری نہیں، اگر صرف اتنا کہا کہ میرا یہ کام ہو گیا تو ایک سال کے روزے رکھوں گا تو یہ نذر ہو گئی اگرچہ اس میں التزام کا صیغہ نہ ہو کیونکہ تعلیق میں دلالتاً التزام موجود ہوتا ہے یہ استحسان ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

برخلاف نذر مطلق کے کہ اس میں جب تک صیغۂ التزام نہ ہو محض اتنا کہنے سے کہ میں روزہ رکھوں گا یا حج کروں گا نذر منعقد نہ ہوگی بلکہ یہ ایک وعدہ ہوگا۔ اس میں انعقاد نذر کے لئے التزام کا صیغہ جیسے میں اس عبادت کی نذر مانتا ہوں یا اپنے ذمہ اس عبادت کو لازم کرتا ہوں وغیرہ صیغۂ التزام کے ساتھ کہنا ضروری ہے۔[2]

استدراک: لیکن اگر سوال ہو کہ مثلاً کوئی یوں کہے: "اگر حکومت اجازت دے گی تو میں حج کو جاؤں گا" یا "میرا لڑکا سفر سے آجائے گا تو حج کو جاؤں گا" وغیرہ تو مسئلہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے نذر نہیں ہوتی ہے حالاں کہ ان میں بھی تعلیق موجود ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ صیغۂ التزام کے بغیر بھی نذر ہو جانی چاہئے، تو جواب یہ ہے کہ عرفاً ہر تعلیق سے نذر مراد نہیں ہوتی ہے بلکہ شفاء امراض و دفع بلیات و حصول مقاصد وغیرہ کے ساتھ تعلیق ہو اور شکرانہ کے طور پر کوئی عبادت مقرر کی جائے تو اس سے نذر مراد

← المنجز ونذر التردد ومحمل ما يقتضي اجزاء الكفار نذر اللجاج. (تفسير مظهری: ۲۸۴/۶، سورة الحج، الاية ۲۹ المكتبة الشاملة)

---

(۱) (الأشباه والنظائر)

(۲) أما الصيغة فلله وعلي نذرت لله وانا افعل ان كان معلقا كانا احج ان دخلت الدار بخلاف انا احج منجزا (الاشباه والنظائر، البزازية على الهندية: ۳۱۴/۴)

ہوتی ہے اور پیش کردہ مثالوں میں ایسی تعلیق نہیں ہے لہذا نذر منعقد نہ ہوگی۔ [۱]

۵۴۳- **ضابطہ**: نذر میں ضروری ہے کہ جس کی نذر مانی جائے شرعاً اس کا وجود فی نفسہ ممکن ہو۔ [۲]

تفریع: پس اگر کسی شخص نے رات میں روزہ رکھنے کی نذر مانی، یا کسی عورت نے زمانۂ حیض میں روزہ کی نذر مانی تو یہ نذر منعقد نہ ہوگی، کیونکہ رات میں اور حیض کی حالت میں شرعاً روزہ فی نفسہ ممکن نہیں۔ کیونکہ رات روزے کا محل نہیں اور حیض ونفاس سے پاک ہونا صوم شرعی کے وجود کی شرط ہے۔ [۳]

برخلاف عید الفطر کے دن یا ایام تشریق میں روزہ کی نذر مانی تو یہ نذر معتبر ہوگی کیونکہ اس میں ممانعت فی نفسہ نہیں بلکہ لغیرہ ہے، اور وہ "غیر" اللہ تعالیٰ کی ضیافت ہے، کہ روزہ رکھنے میں اس ضیافت سے اعراض لازم آتا ہے۔ البتہ اس پر واجب ہے کہ وہ اس دن روزہ نہ رکھے اور دوسرے دنوں میں اس کی قضاء کرلے۔

۵۴۴- **ضابطہ**: حرام اور ممنوع چیز کی نذر صحیح نہیں۔ [۴]

تفریعات:

(۱) پس مروج قرآن خوانی کی نذر صحیح نہیں، کیونکہ وہ رسم اور بدعت ہے۔ [۵]

(۱) (مستفاد: احسن الفتاویٰ: ۵/ ۴۸۷) (۲) (بدائع الصنائع: ۵/ ۸۲، شاملة)

(۳) (منها) أن يكون متصور الوجود في نفسه شرعا، فلا يصح النذر بما لا يتصور وجوده شرعا كمن قال: لله - تعالى - علي أن أصوم ليلا أو نهارا أكل فيه، وكالمرأة إذا قالت: لله علي أن أصوم أيام حيضي؛ لأن الليل ليس محل الصوم، والأكل مناف للصوم حقيقة والحيض مناف له شرعا؛ إذ الطهارة عن الحيض والنفاس شرط وجود الصوم الشرعي (بدائع الصنائع: ۵/ ۸۲)

(۴) (والنذر بالمعاصي لا يصح لما بينا (بدائع: ۵/ ۸۳)

(۵) (احسن الفتاویٰ: ۳/ ۴۸۰)

(۲) قبروں پر چادر، پھول یا ناریل چڑھانے وغیرہ کی نذر بھی درست نہیں کہ یہ بدعت اور ممنوع ہے۔

(۳) اسی طرح مروج مولود کی نذر بھی باطل ہے کہ شرعاً یہ بدعت، بے اصل اور ناجائز ہے۔(۱)

البتہ ان صورتوں میں نذر ماننے والے کو کفارۂ قسم ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معصیت میں نذر کا اعتبار نہیں اور اس کا کفارہ کفارۂ یمین ہے، لا نذر فی معصیة اللہ و کفارته کفارة یمین۔(۲)

استثناء: لیکن اگر اپنے بیٹے یا کسی انسان کی قربانی کی نذر مانی تو یہ اگرچہ حرام و ممنوع ہے، مگر طرفین (امام ابوحنیفہ و امام محمدؒ) کے نزدیک استحساناً یہ نذر معتبر ہے اور اس صورت میں بجائے لڑکے کے کسی جانور کی قربانی اس پر واجب ہوگی، اونٹ کی قربانی افضل ہے ورنہ گائے کی پھر بکری کی۔(۳)

۵۲۵- ضابطہ: نذر زکوٰۃ کے وجوب کو مانع نہیں اور زکوٰۃ کا وجوب مال میں

---

(۱) (فتاویٰ محمودیہ: ۱۴/ ۶۱، أقبح منه النذر بقرأة المولود. شامی: ۲/ ۴۴۰ کتاب الصوم، مکتبہ سعید)

(۲) قال الحنفية والحنابلة: يجب على ناذر المعصية كفارة يمين، لافعل المعصية بدليل حديث عمران بن الحصين وحديث أبي هريرة الثابت عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: : لا نذر في معصية الله و كفارته كفارة يمين۔ (الفقه الإسلامي وأدلته: ۳/ ۴۸۲، مکتبہ الهدیٰ دیوبند)

(۳) ولو قال: لله تعالى علي أن أنحر ولدي أو أذبح ولدي يصح نذره ويلزمه الهدي وهو نحر البدنة أو ذبح الشاة، والأفضل هو الإبل ثم البقر ثم الشاة... وهذا استحسان وهو قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله والقياس أن لا يصح نذره (بدائع: ۵/ ۸۵ شاملة)

صدقہ کو مانع نہیں۔ (۴)

تشریح: پس اگر کسی نے یہ منت مانی کہ اگر میرا یہ کام ہوگیا تو پچاس ہزار صدقہ ہے، اس کا کام ہوگیا، پھر پچاس ہزار پر سال گذر گیا اس کے بعد صدقہ کیا تو ان پچاس ہزار کی زکوۃ واجب ہوگی، کیونکہ منت زکوۃ کے وجوب کو مانع نہیں۔

اسی طرح اگر کسی پر زکوۃ واجب ہوئی اس نے بجائے زکوۃ ادا کرنے کے ایسے ہی صدقہ کر دیا تو یہ صدقہ درست ہے، زکوۃ کا وجوب اس صدقہ کو مانع نہ ہوگا اور زکوۃ بدستور ذمہ میں باقی رہے گی (البتہ اگر سارے مال کا صدقہ کر دے تو پھر زکوۃ ساقط ہو جاتی ہے) (۲)

کتاب اللقطة

تمہید: لقطہ کے معنی ہیں کسی چیز کو اٹھانا اور لینا، اصطلاح میں لقطہ کہتے ہیں کسی کا کھویا ہوا مال جسے دوسرا شخص اٹھا لے، خواہ وہ روپے پیسے ہو یا سونا چاندی یا کوئی اور سامان بلکہ لقطہ حیوان بھی ہوسکتا ہے جیسے گمشدہ اونٹنی، گائے، بکری وغیرہ۔ لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ضائع ہونے کا اندیشہ بلکہ غالب گمان ہے یعنی نہیں اٹھائے گا تو ضائع ہوجائے گا تو اس کا اٹھانا اور اصل مالک تک پہنچانا واجب ہے، اور اگر ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اور اپنے آپ پر اطمینان بھی ہے کہ کما حقہ اس کی تشہیر کر سکے گا تو اٹھانا مستحب ہے اور اگر خود پر اطمینان نہیں ہے تو پھر اس کا ترک یعنی نہ اٹھانا اولیٰ ہے۔ (۳)

---

(۴) النذر لایمنع وجوب الزکوۃ ووجوب الزکاۃ لایمنع التصدق فی المال۔ (تاتارخانیۃ: ۲۶۳/۳ م: ۴۲۱۵، زکریا)

(۲) (مراقی الفلاح مع الطحطاوی: ۷۱۳، دار الکتاب دیوبند)

(۳) (ندب رفعها لصاحبها) إن أمن على نفسه تعريفها وإلا فالترك أولى... (وواجب) أي فرض فتح وغيره (عند خوف ضياعها) (الدرالمختار) ←

۵۴۶-**ضابطہ**: لقطہ کو اپنے لئے اٹھانا بحکم غصب ہے اور مالک کے لئے اٹھانا بحکم امانت ہے۔(۱)

تفریع: پس اگر اپنے لئے اٹھایا اور ضائع ہوگیا یا اس میں کچھ نقصان آ گیا تو اس قدر ضمان اس پر واجب ہوگا۔

اور اگر مالک کو پہنچانے کی غرض سے اٹھایا اور بغیر کسی کوتاہی اور تعدی کے ہلاک ہوگیا تو اس پر ضمان واجب نہ ہوگا لیکن اگر ہلاکت میں اس کی کوتاہی کا دخل ہو تو ضامن ہوگا جیسا کہ امانت کا حکم ہے۔

اور اس بات کی پہچان کہ اس نے اپنے لئے اٹھایا ہے یا مالک کے لئے تو وہ دو طرح سے ہوسکتی ہے ایک یہ کہ: مالک خود اس کی تصدیق کرے کہ اس نے نیک نیتی سے اٹھایا تھا نہ کہ بدنیتی سے، دوسرے یہ کہ: اٹھانے والا لوگوں میں یہ اعلان کردے کہ میں نے لقطہ اٹھایا ہے یا میرے پاس لقطہ کی یہ چیز ہے جو شخص اس کا متلاشی ہو اس کو میرے پاس بھیج دیا جائے فقہ کی اصطلاح میں اس کو "اشہاد" کہا جاتا ہے اور اس کے قائل امام اعظم ابوحنیفہؒ ہیں جبکہ صاحبینؒ فرماتے ہیں لقطہ اٹھانے والا قسم کھا کر کہہ

← وفي الشامية:(قوله: فتح وغيره) أي كالخلاصة والمجتبى، لكن في البدائع أن الشافعي قال: إنه واجب وهو غير سديد؛ لأن الترك ليس تضييعا بل امتناع عن حفظ غير ملتزم كالامتناع عن قبول الوديعة اهـ وأشار في الهداية إلى التبري من الوجوب بقوله وهو واجب إذا خاف الضياع على ما قالوا بحر ملخصا، وجزم في النهر بأن ما في البدائع شاذ وأن ما في الخلاصة جرى عليه في المحيط والتتارخانية والاختيار وغيرها. اهـ.قلت: وكذا في شرح الوهبانية تبعا للذخيرة (قوله: عند خوف ضياعها) المراد بالخوف غلبة الظن كما نقلناه (شامي:۴/۲۷۶)

---

(۱)(بدائع:۶/۲۰۱،شاملہ)

دے کہ میں نے یہ لقطہ بدنیتی سے نہیں اٹھایا تو کافی ہے اور غصب کے الزام سے وہ بری ہو جائے گا۔ (۱)

۵۴۷- **ضابطہ**: لقطہ کو اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دینے سے ذمہ ساقط ہو جاتا ہے خواہ اٹھا کر وہیں رکھدیا ہو یا دوسری جگہ لے جا کر پھر واپس لایا ہو اور خواہ پھر رکھنے میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو یا نہ ہو۔ (۲)

تشریح: یہ ظاہر الروایت ہے اور یہی راجح ہے جبکہ بعض مشائخ کا قول یہ ہے کہ اگر دوسری جگہ لے جا کر پھر لوٹایا تو ضامن ہوگا اور بعض نے تو مطلقاً ضمان کا کہا ہے۔

اور خانیہ میں ہے کہ ظاہر الروایت کا یہ حکم اس وقت ہے کہ اس نے تشہیر کی نیت سے اٹھایا ہو اگر خود کے استعمال کی نیت سے اٹھایا تو پھر مالک تک پہنچانا ضروری ہو جائے گا اب لوٹانے سے بری نہ ہوگا۔ (۳)

---

(۱) أما حالة الأمانة: فهي أن يأخذها لصاحبها لأنه أخذها على سبيل الأمانة فكانت يده يد أمانة كيد المودع وأما حالة الضمان: فهي أن يأخذها لنفسه لأن المأخوذ لنفسه مغصوب وهذا لا خلاف فيه وإنما الخلاف في شيء آخر وهو أن جهة الأمانة إنما تعرف من جهة الضمان إما بالتصديق أو بالإشهاد عند أبي حنيفة وعندهما بالتصديق أو باليمين حتى لو هلكت فجاء صاحبها وصدقه في الأخذ له لا يجب عليه الضمان بالإجماع، وإن لم يشهد؛ لأن جهة الأمانة قد ثبتت بتصديقه وإن كذبه في ذلك فكذا عند أبي يوسف ومحمد أشهد أو لم يشهد ويكون القول قول الملتقط مع يمينه، وأما عند أبي حنيفة فإن أشهد فلا ضمان عليه؛ لأنه بالإشهاد ظهر أن الأخذ كان لصاحبه فظهر أن يده يد أمانة وإن لم يشهد يجب عليه الضمان ولو أقر الملتقط أنه أخذها لنفسه يجب عليه الضمان؛ لأنه أقر بالغصب والمغصوب مضمون على الغاصب. (بدائع: ۲۰۱/۶ شاملہ)

(۲) (بدائع: ۲۰۱/۶ شاملہ، شامی: ۲۷۷/۴ شاملہ)

(۳) ولو أخذ اللقطة ثم ردها إلى مكانها الذي أخذها منه لا ضمان عليه في ←

۵۴۸-ضابطہ: لقطہ میں اعلان کی کوئی تحدید نہیں بلکہ ملتقط کی رائی پر موقوف ہے جب تک اس کو امید مالک کے آنے کی ہو اعلان کرتا رہے اور جب یہ ظن غالب ہو جائے کہ اب اس کا مالک نہیں آئے گا صدقہ کر دے۔[1]

تشریح: اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ لقطہ کی قدر و قیمت کے اعتبار سے اعلان کی مدت میں کمی بیشی ہوگی اگر سو درہم سے زیادہ کا لقطہ ہو تو ایک سال اعلان کرے اور دس درہم کی مالیت کا ہو تو ایک ماہ تک اور تین دراہم کے بقدر ہو تو ایک ہفتہ تک اعلان کرے، مگر یہ کہ کوئی چیز خراب ہونے والی ہو تو اس مدت کا انتظار نہ کرے خراب ہونے سے پہلے ہی صدقہ کر دے۔ جبکہ امام محمد نے مبسوط میں قلیل اور کثیر کی کوئی تفصیل نہیں کی ہے اور لقطہ میں مطلقاً ایک سال کی حد بیان کی ہے۔
لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں مدت کی کوئی تحدید نہیں بلکہ اٹھانے والے کی رائی پر

← ظاهر الرواية وكذا نص عليه محمد في الموطأ، وبعض مشايخنا - رحمهم الله - قالوا: هذا الجواب فيما إذا رفعها ولم يبرح عن ذلك المكان حتى وضعها في موضعها فأما إذا ذهب بها عن ذلك المكان ثم ردها إلى مكانها يضمن وجواب ظاهر الرواية مطلق عن هذا التفصيل مستغن عن هذا التأويل. (بدائع: ۲۰۱/۶، شاملة) (قوله: لم يضمن في ظاهر الرواية) هذا إذا أخذها ليعرفها فلو ليأكلها لا يبرأ ما لم يردها إلى ربها كما في [نور العين] عن الخانية، وقدمناه عن كافي الحاكم، وأطلقه فشمل ما إذا ردها قبل أن يذهب بها أو بعده. قال في الفتح: وقيده بعض المشايخ بما إذا لم يذهب بها، فلو بعده ضمن، وبعضهم ضمنه مطلقا، والوجه ظاهر المذهب اهـ وشمل أيضا ما لو خاف بإعادتها الهلاك، وهو مؤيد لما استظهره في النهر (شامي: ۲۷۷/۴، شاملة)

(۱) وقيل إن هذه المقادير كلها ليست بلازمة، وإنما يعرفها مدة يقع بها التعريف وعليه الفتوى (الجوهرة النيرة: ۳۵۶/۱، شاملة)

موقوف ہے جب تک مالک کے آنے کی اس کو توقع ہو اعلان کرتا رہے، اور جب غالب گمان یہ ہو جائے کہ اس کا مالک اب نہ آئے گا اس کو صدقہ کردے خواہ وہ چیز قیمتی ہو یا سستی ہو اور اگرچہ یہ غالب گمان اس کو ایک ہفتہ میں حاصل ہو یا ایک ماہ میں یا اس سے زائد مدت میں، یہ غیر ظاہر الروایت ہے اور شمس الائمہ سرخسی نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے، ہدایہ میں اسی کو صحیح کہا ہے اور ینابیع اور جوہرہ وغیرہ میں ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے۔[۱]

اور اعلان سے مراد یہ ہے کہ بازار یا مساجد کے دروازوں پر یا جہاں لوگوں کی گذرگاہ ہو وہاں اعلان کرے، آج کل اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ بھی تشہیر کے ذرائع ہیں لقطہ کی اہمیت وقیمت کے لحاظ سے ان کا بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مسجد کے اندر اعلان نہ کرے کہ یہ مسجد کے آداب کے خلاف ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

(۱) (فإن كانت) اللقطة (أقل من عشرة دراهم عرفها) : أي نادى عليها حيث وجدها، وفي المجامع (أياما) على حسب رأى الملتقط، بحيث يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعدها (وإن كانت عشرة فصاعداً عرفها حولا) قال في الهداية: وهذه رواية عن أبي حنيفة، وقدر محمد في الأصل بالحول من غير تفصيل بين القليل والكثير، ثم قال: وقيل: الصحيح أن شيئا من هذه المقادير ليس بلازم، ويفوض إلى رأى الملتقط، يعرفها إلى أن يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعد ذلك، اهـ. ومثله في شرح الأقطع قائلا: وهذا اختيار شمس الأئمة، وفي الينابيع: وعليه الفتوى، ومثله في الجواهر (اللباب في شرح الكتاب: ۲/ ۲۰۸) ولم يجعل للتعريف مدة اتباعا لشمس الأئمة السرخسي فإنه بنى الحكم على غالب الرأي فيعرف القليل والكثير إلى أن يغلب على رأيه أن صاحبه لا يطلبه بعد ذلك وصححه في الهداية وقال في البزازية والجوهرة وعليه الفتوى وهو خلاف ظاهر الرواية (البحر الرائق: ۵/ ۱۶۳، شاملة)

جس کسی کو سنو کہ وہ مسجد میں اپنی گمشدہ چیز کا اعلان کرتا ہے تو کہہ دو "لاَ رَدَّھَا اللہ عَلَیکَ" اللہ تعالیٰ تیری چیز واپس نہ کریں![1] اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ لقطہ اٹھانے والے کو حکم دیتے تھے کہ مسجد کے دروازہ پر اعلان کرے۔[2]

البتہ جو چیز مسجد کے اندر ہی میں گم ہو یا جو لقطہ وہاں سے ملے اس کا اعلان مسجد میں جائز ہے، لیکن ضروری ہے کہ مسجد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے شور و شغب سے مکمل اجتناب ہو۔[3]

فائدہ (۱): پھر اعلان و تشہیر کے بعد لقطہ کا مالک آجائے اور گواہ پیش کردے تو اس کو وہ لقطہ حوالہ کرنا واجب ہے اور اگر گواہ پیش نہ کرسکے لیکن اس کی علامات بتلادے تو حوالہ کرنا جائز ہے تاہم واجب نہیں واجب اس وقت ہے جب وہ گواہ پیش کردے اس لئے لقطہ اٹھانے والے کو یہ حق ہے کہ جب تک مدعی گواہ پیش نہ کردے وہ لقطہ اس کے حوالہ نہ کرے۔[4]

---

(۱)(مسلم شریف : ۱/ ۳۹۷، حدیث ۵۶۸، باب النهي عن نشد الضالة في المسجد، شاملة) (۲)(المغنی: ۶/ ۵)

(۳) وأما إنشاد الضالة فله صورتان : إحداهما: وهي أقبح وأشنع بأن يضل شيء خارج المسجد ثم ينشده في المسجد لأجل اجتماع الناس فيه ۔ والثانية: أن يضل في المسجد نفسه فينشده فيه وهذا يجوز إذا كان من غير لغط وشغب ۔ (معارف السنن، ابواب الصلوة، باب ماجاء في كراهية البيع والشراء وإنشاد الضالة في المسجد: ۳/ ۳۱۳، مكتبه سعيد ،هكذا في العرف الشذى : ۱/ ۸۰، مكتبه سعيد)

(۴)(وإذا حضر رجل فادعى أن اللقطة له لم تدفع إليه) بمجرد دعواه (حتى يقيم البينة) اعتبارا بسائر الدعاوى (فإن أعطى علامتها حل للملتقط أن يدفعها إليه) لأن الظاهر أنها له (ولا يجبر على ذلك في القضاء) لأن غير المالك قد يعرف وصفها (اللباب في شرح الكتاب: ۲/ ۲۱۱، شاملة)

اور واپس کرتے وقت ملتقط کا مالک سے کوئی معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں، تاہم مالک انعاماً اس کو کچھ دیدے تو وہ اس کے حسن اخلاق میں سے ہوگا، البتہ اگر مالک نے یہ اعلان کیا ہو کہ جو شخص میری گمشدہ چیز لا کر دے گا میں اس کو اتنا اتنا انعام دوں گا تو تاتارخانیہ میں ہے اس صورت میں اٹھانے والا اجرت مثل کا مستحق ہوگا کیونکہ یہ اجارہ فاسدہ ہے اور اجارۂ فاسدہ میں مستاجر اجرت مثل کا مستحق ہوتا ہے (لیکن اگر مالک اپنی خوشی سے وہ مقررہ انعام دیتا ہے تو ملتقط کے لئے لینے میں کوئی حرج نہیں، مگر مطالبہ جائز نہیں)[1]

اور اگر مالک کے آنے کی توقع نہ ہو یا اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہو تو غریب مستحق کو صدقہ کردے اگر خود غریب ہو تو خود بھی کام میں لے سکتا ہے، مگر مالک آکر ملتقط سے یا جس فقیر کو صدقہ کیا گیا ہے اس سے مانگ سکتا ہے وہ چیز موجود نہ ہو تو اس کی قیمت لے سکتا ہے۔ پھر مالک جس کسی سے بھی وصول کرے ملتقط سے یا فقیر سے اب وہ دوسرے سے رجوع نہیں کرے گا یعنی اگر اس نے ملتقط سے وصول کیا ہے تو وہ فقیر سے رجوع نہیں کرے گا اور فقیر سے لیا ہے تو وہ ملتقط سے رجوع نہیں کرے گا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک مالک کا ضامن تھا ملتقط تو بلا اجازت مالک صدقہ کرنے سے اور فقیر بلا اجازت مالک قبول کرنے سے۔[2]

---

(۱) وفي المنح: ولو التقط لقطة أو وجد ضالة فرده على أهله لم يكن له جعل وإن عوضه شيئا فحسن ولو قال من وجده فله كذا فأتى به إنسان يستحق أجرة مثله كما في التتارخانية (مجمع الانهر: ۱/۷۰۶)

(۲) (فإن جاء ربها بعده) أي بعد التصدق بعد التعريف مدته (أجازه) أي التصدق ربها (إن شاء) ولو بعد هلاكها لأن التصدق وإن حصل بإذن الشرع لكن لم يحصل بإذنه فيتوقف على إجازته وإنما قيدنا ولو بعد هلاكها لئلا يتوهم اشتراط قيامها للإجازة وليس ذلك بشرط (وأجره له) أي ثواب التصدق ←

فائدہ (۲): گھڑی ساز کے یہاں لوگ گھڑی ٹھیک کرنے اسی طرح کاریگر کے پاس اپنی مشینیں صحیح کرنے دیتے ہیں اور کبھی ان میں کوئی ایسا مالک ہوتا ہے کہ وہ اپنی چیز واپس لینے نہیں آتا ہے اور نہ اس کے متعلق کچھ علم ہوتا ہے کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے، اسی طرح اخبار ورسائل کی پیشگی قیمت دینے کے بعد بعض مرتبہ اس مشتری کا کوئی اتا پتہ نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی وارث معلوم ہوتا ہے، اسی طرح سیلاب کے پانی میں بہہ کر آنے والی چیز کا مالک بھی نامعلوم ہوتا ہے تو یہ تمام چیزیں لقطہ کے حکم میں ہیں ان سب میں وہی حکم جاری ہوگا جو اوپر بیان ہوا۔

۵۴۹- **ضابطہ:** ہر وہ چیز جس میں فساد جلدی طاری نہیں ہوتا ہے اور اس کو پھینکنے کی لوگوں میں عادت بھی نہیں ہے تو اگر قابل قیمت چیز ہے تو مالک تک پہنچانا ضروری ہے، ورنہ ضروری نہیں۔

تفریع: جیسے ایندھن کی لکڑیاں اخروٹ وغیرہ اگر زیادہ مقدار میں ہیں اور قابل قیمت ہیں تو لقطہ ہے مالک تک پہنچانا ضروری ہے، اگرچہ وہ چیز منتشر ہو اور ایک ایک جمع کر کے قابل قیمت ہوئی ہو۔ اور اگر قابل قیمت نہ ہو تو وہ لقطہ نہیں ہے پس اس میں اعلان ضروری نہیں خود کام میں لاسکتا ہے تاہم مالک آکر مانگے تو دینا ضروری ہے۔

برخلاف سیب، امرود وغیرہ اشیائے خوردنی جو پانی میں بہہ کر جارہی ہوں تو ان کو

← له (أو ضمن الملتقط) لأنه سلم ماله إلى غيره بغير إذنه ولو بأمر القاضي وهو الصحيح لأن أمره لا يكون أعلى من فعله والقاضي لو تصدق بها كان له أن يضمنه (أو) ضمن (الفقير لو) كانت (هالكة) قيد لهما جميعا لأنه قبض ماله بغير إذنه (وأيهما ضمن لا يرجع على الآخر) لأن كلا منهما ضامن بفعل الملتقط بالتسليم بغير إذن صاحبها والفقير بالتسليم بدون إذنه (ويأخذها) أي المالك اللقطة (منه) أي من الفقير (إن) كانت (باقية) لأنه وجد عين ماله. (مجمع الانهر: ۱/۷۰۶، شاملة)

نکال کر کھا سکتے ہیں کہ ان میں فساد طاری ہو جاتا ہے اور نہ نکالیں گے تو بگڑ کر یوں ہی برباد ہو جائیں گی۔

اور برخلاف کھجور، آم وغیرہ کی گٹھلیاں اور پانی اور کولڈ ڈرینک وغیرہ کی بوتلیں جنہیں لوگ عادتاً پھینک دیتے ہیں تو وہ لقطہ نہیں اگر چہ کافی مقدار میں جمع کرنے کے بعد قابل قیمت ہو گئی ہوں پس ان کو استعمال کر سکتا ہے۔ (۱)

کتاب اللقیط

تمہید: لقیط اسم مفعول ملقوط کے معنی میں ہیں یعنی اٹھایا ہوا بچہ، اصطلاح میں وہ لاوارث پڑا ہوا بچہ ہے جس کو عموماً فقر و محتاجی یا تہمت زنا کی جہ سے یوں ہی پھینک دیا جاتا ہے اور اس کے والدین کا کوئی اتا پتہ نہیں ہوتا ہے۔ ایسے بچہ کو اٹھالینا فرض کفایہ ہے اگر کسی نے نہیں اٹھایا اور اس کی جان چلی گئی تو اس علاقہ کے تمام لوگ جن کو علم ہوگا سب گنہگار ہوں گے اور جو کوئی اٹھائے گا وہ ایک انسانی زندگی بچانے کی وجہ سے مستحق ثواب ہوگا اور دوسرے لوگ بھی گناہ سے محفوظ ہو جائیں گے۔ (۲)

---

(۱) ذكر في شرح الوهبانية ضابطا، وهو أن ما لا يسرع إليه الفساد ولا يعتاد رميه كحطب وخشب فهو لقطة إن كانت له قيمة ولو جمعه من أماكن متفرقة في الصحيح كما لو وجد جوزة ثم أخرى وهكذا حتى بلغ ماله قيمة، بخلاف تفاح أو كمثرى في نهر جار فإنه يجوز أخذه وإن كثر؛ لأنه مما يفسد لو ترك، وبخلاف النوى إذا وجد متفرقا وله قيمة فيجوز أخذه؛ لأنه مما يرمى عادة فيصير بمنزلة المباح وَلا كذلك الجوز، حتى لو تركه صاحبه تحت الأشجار فهو بمنزلته (شامی: ۴/ ۲۸۴، شاملہ)

(۲) (هو) لغة ما يلقط فعيل بمعنى مفعول ثم غلب على الولد المنبوذ باعتبار المآل وشرعا (اسم لحي مولود طرحه أهله خوفا من العيلة أو فرارا من تهمة ←

۵۵۰-ضابطہ: جس صورت میں لقیط کا مسلمان ہونا ممکن ہو خواہ علامات سے یا مسلمانوں کے علاقہ میں ملنے سے یا اٹھانے والے کے مسلمان ہونے سے اس کو مسلمان ہی تصور کیا جائے گا۔

تشریح: لقیط کے مسلمان یا کافر شمار کرنے میں روایات مختلف ہیں ظاہر الراوایت یہ ہے کہ اس میں جگہ کا اعتبار ہوگا یعنی مسلمانوں کی بستی یا محلہ میں پایا گیا تو وہ مسلمان ہے اور کفار کے علاقہ میں پایا گیا تو وہ کافر ہے، جبکہ ابن سماعہ کی روایت میں جو امام محمدؒ سے منقول ہے یہ ہے کہ اٹھانے والا کا اعتبار ہوگا یعنی اگر اٹھانے والا مسلمان ہے تو لقیط مسلمان ہے اور اگر کافر ہے تو وہ کافر ہے خواہ مسلمانوں کے علاقہ سے اس نے اٹھایا ہو یا کفار کے علاقہ سے۔

اور فتح القدیر میں ہے کہ جس صورت میں بھی لقیط کا مسلمان ہونا ممکن ہو خواہ علامات سے یا مسلمانوں کے علاقہ میں ملنے سے یا اٹھانے والے کے مسلمان ہونے سے اس کو مسلمان ہی شمار کریں گے اور رعایتاً اس کے اسلام سے عدول نہیں کیا جائے گا پس ایک ہی صورت میں وہ کافر ہوگا وہ کہ اٹھانے والا کافر ہو اور لقیط کفار کے علاقہ میں پایا گیا ہو اور اسلام کی کوئی علامت بھی اس پر نہ ہو، اس کے علاوہ باقی تمام صورتوں میں وہ مسلمان شمار ہوگا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کنز وغیرہ کا ظاہر یہی ہے اور بحر میں بھی یہی ہے کہ حتی الامکان اس کو مسلمان تسلیم کرنے سے عدول نہیں کیا جائے گا۔ (۱)

← الريبة) مضيعه آثم محرزه غانم (التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلاكه لو لم يرفعه) ولو لم يعلم به غيره ففرض عين (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۴/ ۲۶۹، شاملة)

---

(۱) اختلفت الرواية ففي كتاب اللقيط العبرة للمكان لسبقه ولأن المسلم لا يضع ولده في البيعة ولا الكافر في المساجد وفي رواية ابن سماعة عن محمد العبرة للواجد لقوة اليد (كنز الدقائق على هامش تبيين الحقائق: ←

پھر جب اس کا مسلمان ہونا ثابت ہوگا تو اس کی موت پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور دیگر احکام اسلام اس کے لئے ثابت ہوں گے۔

۵۵۱- **ضابطہ:** لقیط کا نسب ہر اس شخص سے ثابت ہوجائے گا جو اس کا دعویٰ کرے خواہ وہ مدعی مسلم ہو یا غیر مسلم اور خواہ اس کے پاس گواہ موجود ہوں یا نہ ہوں بشرطیکہ تکذیب کی کوئی وجہ نہ ہو۔

تشریح: لقیط کے اثبات نسب میں وسعت ہے یہاں تک کہ جو کوئی بھی دعویٰ کرے اس سے نسب ثابت ہوجاتا ہے خواہ وہ مدعی مسلم ہو یا غیر مسلم اور خواہ اس کے پاس گواہ اور ثبوت ہو یا نہ ہو لیکن بظاہر اس کی تکذیب کی کوئی وجہ بھی نہ ہو کیونکہ اس میں لقیط کا فائدہ ہے کہ وہ مجہول النسب نہ رہے گا، اور شرافت نسب بھی حاصل ہوگی، اور خود مدعی کا بھی فائدہ ہے کہ اسے اس لقیط سے تقویت حاصل ہوگی اور قاعدہ ہے کہ جس دعویٰ میں مدعی کا فائدہ ہو اور دوسرے کا نقصان نہ ہو تو اسے بلا ثبوت بھی قبول کیا جاتا ہے۔[1]

→ ۲۹۹/۳، شاملة) (قوله فظاهر الرواية اعتبار المكان) أي في الصورتين وفي بعض نسخ المبسوط اعتبر الواجد، وفي بعضها اعتبر الإسلام أي ما يصير به الولد مسلما نظرا له، ولا ينبغي أن يعدل عن ذلك. وقيل يعتبر بالسيما والزي فتح. وعلى ما رجحه في الفتح يصير مسلما في ثلاث صور، وذميا في صورة واحدة وهي ما لو وجده ذمي في مكانهم وهو ظاهر الكنز وغيره. وقال في البحر أيضا: ولا يعدل عنه (شامي: ۲۷۳/۴، شاملة)

(۱) وجه الاستحسان: أنه عامل أخبر بأمر محتمل الثبوت وكل من أخبر عن أمر والمخبر به محتمل الثبوت يجب تصديقه تحسينا للظن بالمخبر، هو الأصل إلا إذا كان في تصديقه ضرر بالغير وههنا في التصديق وإثبات النسب نظر من ←

چنانچہ اگر مسلمانوں کے علاقہ میں پایا جائے اور کوئی کافر اس کے نسب کا دعویٰ کرے تو استحساناً اس کافر سے بھی نسب ثابت ہوجائے گا اگرچہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہاں کافر سے نسب ثابت نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس میں لقیط کے اس اسلام کی نفی ہوتی ہے جو مسلمانوں کے علاقہ میں پائے جانے سے ثابت ہوا تھا، استحسان کی وجہ یہ ہے کہ کافر کا دعویٰ دو چیزوں کو متضمن ہے ایک نسب جس میں لقیط کا فائدہ ہے دوسرے اسلام کی نفی جس میں لقیط کا نقصان ہے لیکن کافر سے ثبوت نسب میں صغیر کا کافر ہونا لازم نہیں آتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ صغیر مسلمان ہو اور اس کا باپ کافر ہو جیسا کہ کسی بچہ کی ماں تنہا مسلمان ہوجائے تو ماں کی تبعیت میں وہ بچہ مسلمان شمار ہوتا ہے جبکہ اس کا باپ کافر ہوتا ہے، پس مذکورصورت میں ہم کافر کے اس دعویٰ کی تصدیق کریں گے جس میں لقیط کا فائدہ ہے اور وہ دعویٰ نسب ہے، اور اس دعویٰ کی نفی کریں گے جس میں لقیط کا نقصان ہے اور وہ دعویٰ کفر ہے۔[1]

← الجانبين جانب اللقيط بشرف النسب والتربية والصيانة عن أسباب الهلاك وغير ذلك، وجانب المدعي بولد يستعين به على مصالحه الدينية والدنيوية، وتصديق المدعي في دعوى ماينتفع به ولا يتضرر به غيره بل ينتفع به لا يقف على البينة، وسواء كان المدعي مسلما أو ذميا أو عبدا حتى لو ادعى نسبه ذمي تصح دعوته (بدائع الصنائع: ۱۹۹/۶)

---

(۱) (و) يثبت نسبه (من ذمي و) لكن (هو مسلم) استحسانا (الدر المختار) وفي الشامية: (قوله: استحسانا) والقياس أن لا يثبت نسبه؛ لأن فيه نفي إسلامه الثابت بالدار. وجه الاستحسان أن دعواه تضمنت شيئين: النسب وهو نفع للصغير ونفي الإسلام الثابت بالدار وهو ضرر به، وليس من ضرورة ثبوت النسب من الكافر الكفر لجواز مسلم هو ابن كافر، بأن أسلمت أمه فصححنا دعواه فيما ينفعه دون ما يضره فتح (شامي: ۲۷۳/۴، شامله) (بدائع الصنائع: ۱۹۹/۶، شامله)

اگر دو تین افراد نسب کا دعویٰ کریں اور ہر ایک کے پاس ثبوت شرعی ہو، اور قرائن وغیرہ سے ترجیح کی کوئی صورت نہ ہو تو ان سب سے نسب ثابت مانا جائے گا اور نسب کے احکام جاری ہوں گے۔(۱)

البتہ کوئی عورت دعویٰ کرے تو اس سے ثبوت نسب میں ضروری ہے کہ اس کا شوہر اس کی تصدیق کرے یا دائی اس کی شہادت دے یا خود عورت دو گواہوں کو پیش کر دے، پس ان تین میں سے کوئی ایک صورت پائی گئی تو لقیط کا نسب اس عورت سے ثابت ہوگا ورنہ ثابت نہ ہوگا، اور عورت کے دعویٰ میں یہ ثبوت اس لئے ضروری ہے کہ عورت کا یہ دعویٰ نسب صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ وہ اگر کسی کو اپنا بیٹا قرار دیتی ہے تو گویا وہ اپنے شوہر کو بھی اس کا باپ قرار دیتی ہے۔(۲)

۵۵۲- **ضابطہ**: لقیط اور لقطہ پر خرچ کرنے میں ملتقط متبرع ہوگا۔

تفریع: پس کسی حیوان کو یا انسانی بچہ کو اٹھانے والے کے لئے حق نہ ہوگا کہ اس نے جو کچھ اس لقطہ اور لقیط پر خرچ کیا ہے وہ جانور کے مالک سے یا بچہ کے والد سے یا اس کے ولی سے یا خود اس بچہ سے [اس کے بالغ ہونے کے بعد] اس خرچ کا مطالبہ کرے، کیونکہ وہ اس خرچ میں متبرع (احسان کرنے والا) ہوتا ہے اس کا یہ نفقہ قابل ضمان نہیں ہے۔ مگر یہ کہ قاضی کی اجازت سے اس نے خرچ کیا ہو تو پھر اس کے لئے مذکور خرچ کا مذکور لوگوں سے مطالبہ کا حق ہوگا کیونکہ قاضی کی اجازت کے بعد یہ نفقہ قابل ضمان ہو جاتا ہے۔(۳)

(۱) لو ادعى أكثر من رجلين لم يثبت منه عند أبي يوسف وأما عند محمد فيثبت من الثلاث لا الأكثر وعن الإمام يثبت من الأكثر. (مجمع الانہر: ۱/۷۰۳، شاملہ)

(۲) فإن كانت امرأة فادعته أنه ابنها فإن صدقها زوجها أو شهدت لها القابلة أو قامت البينة صحت دعوتها وإلا فلا، لأن فيه حمل نسب الغير على الغير وإنه لا يجوز (بدائع الصنائع: ۶/۲۰۰، شاملہ)

←

فائدہ: اگر ملتقط پر جانور کے چارہ پانی کی استطاعت نہ ہو یا اندیشہ ہو کہ خرچ جانور کی قیمت کو مستغرق ہو جائے گا تو قاضی کی اجازت سے اس کو بیچ کر اس کی قیمت مالک کے لئے محفوظ کرلے۔

اسی طرح لقیط (اٹھائے ہوئے بچے) کا نفقہ بھی ملتقط خود ادا کرتا ہے تو احسان کرنے والا ہوگا ورنہ دراصل اس کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہے۔[1] اور جہاں بیت المال کا نظام نہ ہو اور سرکار بھی اس کی ذمہ دار نہ ہو تو اگر اس لقیط کو ضابطہ: ۵۵۰ر میں بیان کے موافق مسلمان تصور کیا گیا ہے تو اس کا نفقہ اصول کے لحاظ سے علمۃ المسلمین پر آنا چاہئے، ورنہ علمۃ الناس پر۔ (مؤلف)

← (۳)(وهو في الإنفاق على اللقيط واللقطة متبرع) لقصور ولايته (إلا إذا قال له قاض أنفق لترجع) فلو لم يذكر الرجوع لم يكن دينا في الأصح (أو يصدقه اللقيط بعد بلوغه) كذا في المجمع أي يصدقه على أن القاضي قال له ذلك لا ما زعمه ابن الملك نهر، والمديون رب اللقطة وأبو اللقيط أو سيده أو هو بعد بلوغه (الدر المختار: ۴/ ۲۸۱، شاملة)

(۱) (مستفاد: بدائع: ۶/ ۲۰۳، شاملہ)

کتاب الوقف

۵۵۳- **ضابطہ:** صحت وقف کے لئے وہ سب شرائط لازم ہیں جو تمام تبرعات میں لازم ہیں۔ (۱)

تشریح: پس ہدیہ، قرض، عاریت وغیرہ اقسام تبرعات میں جو شرائط: مثلاً متبرع کا عاقل، بالغ، آزاد وغیرہ ہونا لازم ہیں وقف میں بھی یہ سب شرائط لازم ہوں گی، کیونکہ وقف بھی ایک گونہ تبرع ہے۔

پس نابالغ، مجنون، غلام، مکرہ یعنی جس پر زبردستی کی گئی ہو اسی طرح بیہوش اور سونے والے کا وقف معتبر نہ ہوگا، ان کی ملکیت اس شیء موقوف پر سے ختم نہ ہوگی، کیونکہ ان میں تبرع کی اہلیت نہیں ہے۔

اور کافر کا وقف صحیح ہے کیونکہ تبرع کی صحت کے لئے اسلام شرط نہیں۔ (۲)

استدراک: تاہم کافر کے وقف کے سلسلہ میں کتب فقہ وفتاویٰ میں اختلاف ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وقف میں ایک جہت قربت کی بھی ہے یعنی کار ثواب کی نیت سے وقف کرنا اور مسجد وغیرہ کے وقف کا کار ثواب ہونا کافر کے مذہب میں نہیں ہے البتہ خود اس کی ذاتی رائے واعتقاد میں کار ثواب ہوسکتا ہے پس جن حضرات نے پہلی

---

(۱)(وشرطه شرط سائر التبرعات) كحرية وتكليف الخ (الدر المختار: ۳۴۰/۴، شاملة)وشرائطه أهلية الواقف للتبرع من كونه عاقلاً بالغاً الخ (البحر: ۳۱۳/۵، رشيديه)

(۲) أما الاسلام فليس من شرطه فيصح وقف الذمي بشرط كونه قربة الخ (البحر الرائق: ۳۱۶/۵، رشيديه)

بات کا اعتبار کیا ان کے نزدیک کافر کا وقف صحیح نہیں اور جنہوں نے دوسری بات یعنی کافر کی ذاتی رائے کا اعتبار کیا ان کے نزدیک اگر کافر بنیت قربت مسلمانوں کے لئے مسجد وغیرہ کا وقف کرتا ہے تو یہ صحیح ہے، اردو فتاویٰ میں: فتاویٰ رشیدیہ، کفایت المفتی، فتاویٰ محمودیہ وغیرہ میں کافر کے وقف کی صحت کا فتویٰ دیا گیا ہے، جبکہ فتاویٰ دار العلوم، امداد الفتاویٰ وغیرہ میں عدم صحت کا فتویٰ مذکور ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم نے فتاویٰ دار العلوم: ۱۴؍۴۳ پر کافر کے وقف کے سلسلہ میں ایک چشم کشا حاشیہ تحریر فرمایا ہے جس میں مذکور اختلاف کو بیان کرتے ہوئے دلائل کی روشنی میں صحت کے فتویٰ کو راجح قرار دیا ہے، تفصیل کے لئے وہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

۵۵۴- **ضابطہ**: وقف کردہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں آجاتی ہے۔

تشریح: یوں تو ہر چیز کے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں لیکن انہوں نے انسان کو کچھ چیزوں کا نیابتاً مالک بنایا ہے اور اس پر احکام بھی مرتب فرمائے ہیں تو اگر کوئی انسان اپنی ان نیابتی املاک میں سے کوئی چیز وقف کرتا ہے تو اس پر سے اس کی نیابت بالکل ختم ہوجاتی ہے اور وہ چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملک میں آجاتی ہے، یہ صاحبین رحمہا اللہ کا مسلک ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، پس اس پر یہ مسائل متفرع ہوں گے:(۱)

تفریعات:

(۱) کسی نے زمین وغیرہ کوئی چیز وقف کی تو اس کی بیع، ہبہ، رہن وغیرہ جائز نہیں خود واقف کے لئے بھی اس کی جازت نہیں ہے۔(۲)

---

(۱) وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالى .... إن الفتوى على قولهما (ہندیہ: ۲؍۳۵۰، شاملہ) (۲) (فيزول ملك الواقف عنه إلى الله تعالى فيلزم ولا يباع ولا يرهن ولا يورث الخ (الجوهرة النيرة: ۱؍۳۳۳، شاملة)

(۲)وقف کے بعد واقف یا اس کی اولاد اس وقف کو باطل کرنا چاہے اور رجوع کرنا چاہے تو ان کو یہ اختیار نہیں اور نہ اب اس میں میراث جاری ہوگی۔[1]

(۳)اس وقف کردہ چیز کا استبدال جائز نہیں یعنی مثلاً مسجد یا مدرسہ کی کوئی زمین ہے تو اس کو دوسری زمین سے بدلنا یا اس کو بیچ کر دوسری جگہ زمین خریدنا جائز نہیں۔

لیکن اگر واقف نے اپنے لئے یا کسی اور کے لئے حق استبدال کی شرط لگائی ہو تو پھر استبدال جائز ہے کیونکہ اس کی یہ شرط معتبر ہے اسی طرح وقف کردہ چیز اس حال میں ہوگئی ہو کہ استبدال کے بغیر اس سے انتفاع بالکل ممکن نہ ہو تو دیانت دار قاضی کی اجازت سے استبدال جائز ہے۔ان دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں استبدال جائز نہیں، یہاں تک کہ وقف شدہ چیز کو زیادہ نفع بخش بنانے کے خاطر بھی جائز نہیں ، فتویٰ اسی پر ہے۔[2]

(۴)مسجد کے زائد قرآن یا چٹائی یا اس قسم کا سامان جس کا بناء مسجد میں دخل نہیں ہے بیچنا یا ہدیہ کرنا یا دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔

لیکن بوقت استغناء یعنی جب اس مسجد میں اس کی ضرورت نہ ہو تو دوسری قریب

---

(۱)فلایجوز له إبطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوی(الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۴/ ۳۳۹، شاملة)

(۲) وكذا شرط الواقف الاستبدال بأرض أخرى إذا شاء عند أبي يوسف - رحمه الله تعالى - استحسانا كذا في الخلاصة وعليه الفتوى (ہندیہ: ۲/ ۳۵۲، شاملہ)ولو شرط الواقف في الوقف الاستبدال لكل من ولي هذا الوقف صح ذلك(ہندیہ:۲/ ۴۰۰،شاملہ)ولو صارت الأرض بحال لا ينتفع بها والمعتمد أنه يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية ... وشرط في الإسعاف أن يكون المستبدل قاضي الجنة المفسر بذي العلم والعمل كذا في النهر الفائق (ہندیہ:۲/ ۴۰۱،شاملہ)

کی ضرورت مند مسجد میں واقف کی اجازت سے منتقل کرنا جائز ہے۔واقف کی اجازت اس لئے کہ استغناء کی صورت میں یہ چیزیں ملک واقف میں عود کرآتی ہیں پس اس کی اجازت ضروری ہے[اگر واقف مرگیا ہوتو اس کے ورثاء کی اجازت ضروری ہے مگر یہ کہ واقف کی طرف سے بوقت وقف صراحتاً یا عرفاً استبدال کی اجازت ہوتو پھر اجازت کی ضرورت نہیں]

اور جس سامان کا تعلق بناء مسجد کے ساتھ ہے جیسے اینٹیں ،دروازے وغیرہ جسے ''انقاض المسجد'' کہا جاتا ہے انہیں منتقل کرنا مطلقاً جائز نہیں یعنی نہ واقف کی اجازت سے اور نہ بغیر اجازت کے بلکہ ان کو بعینہ یا بیچ کر ان کی قیمت اسی مسجد میں یا وہ مسجد نہ رہے تو دوسری قریب کی حاجت مند مسجد میں صرف کرنا ضروری ہے، کیونکہ مسجد ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے لہٰذا جس سامان کا تعلق اس کی بناء سے ہوگا اس میں بھی ہمیشگی آئے گی ایسا سامان استغناء کی صورت میں بھی واقف کی ملکیت میں عود نہیں کرتا ہے فتوی اسی پر ہے۔(۱)

(۱) ولو خرب المسجد، وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف ثمنه إلى بعض المساجد اهـ (قوله: ومثله حشيش المسجد إلخ) أي الحشيش الذي يفرش بدل الحصر، كما يفعل في بعض البلاد كبلاد الصعيد كما أخبرني به بعضهم قال الزيلعي: وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه إذا استغني عنهما يرجع إلى مالكه عند محمد وعند أبي يوسف ينقل إلى مسجد آخر، وعلى هذا الخلاف الرباط والبئر إذا لم ينتفع بها اهـ وصرح في الخانية بأن الفتوى على قول محمد قال في البحر: وبه علم أن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد وعلى قول أبي يوسف في تأبيد المسجد اهـ والمراد بآلات المسجد نحو القنديل والحصير، بخلاف أنقاضه لما قدمنا عنه قريبا من أن الفتوى على أن المسجد لا يعود ميراثا ولا ←

۵۵۵-ضابطہ: وقف کے منافع سے خرید کردہ اشیاء بحکم وقف نہیں ہیں۔

تفریع: پس جیسے اصل وقف شدہ چیز کا حکم ہے کہ جب تک اس سے انتفاع متعذر نہ ہو اس کی بیع، استبدال وغیرہ جائز نہیں؛ وقف کے منافع سے خرید کردہ اشیاء کا یہ حکم نہ ہوگا بلکہ متولی یا ناظر کے لئے مطلقاً بغیر کسی شرط کے (یعنی خواہ ان اشیاء سے انتفاع ممکن ہو یا نہ ہو) کسی مصلحت سے ان کو بیچنے وغیرہ کا اختیار ہوگا، یہی مختار ہے۔[1]

۵۵۶-ضابطہ: واقف کی شرط وجوب عمل اور مفہوم ودلالت میں نص شارع کی طرح ہے۔[2]

تشریح: یعنی نص کی توضیح وتفہیم میں جن اصول وقواعد کی رعایت کی جاتی ہیں واقف کی شرط کو سمجھنے میں بھی انہیں اصول وقواعد کا لحاظ کیا جائے گا، چنانچہ اگر واقف کی شرط محکم وظاہر ہے اس میں کسی تاویل وتخصیص کا احتمال نہیں ہے تو بلا تردد اس پر عمل کیا جائے گا اسی طرح اگر محتمل ہے اور اس پر کوئی قرینہ بھی ہے تو اس پر عمل لازم ہوگا اور اگر مجمل ہے اور واقف زندہ ہے تو اس کے بیان کی طرف رجوع کیا جائے گا، ورنہ اس پر

← يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر (شامي: ۳۵۹/۴ فرع بناء بيتا للإمام فوق المسجد، شاملة)

(۱) ويزاد ما في الفتح حيث قال: واعلم أن عدم جواز بيعه إلا إذا تعذر الانتفاع به إنما هو فيما إذا ورد عليه وقف الواقف أما إذا اشتراه المتولي من مستغلات الوقف فإنه يجوز بيعه بلا هذا الشرط لأن في صيرورته وقفا خلافا والمختار أنه لا يكون وقفا فللقيم أن يبيعه متى شاء لمصلحة عرضت. اهـ. (شامي: ۳۷۷/۴، مطلب في الوقف اذا خرب ولم يمكن عمارته، شاملة)

(۲) شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به وفي المفهوم والدلالة۔ (قواعد الفقہ: ۸۵، قاعدہ: ۱۵۳)

عمل ممکن نہ ہوگا۔ (۱)

اسی طرح عمل کے سلسلہ میں جس طرح نص پر عمل واجب ہے، واقف کی شرط پر بھی عمل واجب ہے، بشرطیکہ وہ شرط شریعت اور وقف کے مفاد کے خلاف نہ ہو، چنانچہ:

(۱) اگر اس نے شرط لگائی کہ: اس وقف کی آمدنی فلاں مصرف میں خرچ کی جائے تو اسی مصرف میں خرچ کرنا واجب ہے یہاں تک کہ اگر کہا فلاں مدرسہ یا مسجد میں صرف کی جائے تو اسی مسجد و مدرسہ میں خرچ کرنا ضروری ہے، اس سے تجاوز جائز نہیں۔ (۲)

(۲) اسی طرح اگر اس نے شرط لگائی کہ: میرے لئے یا متولی کے لئے اس وقف کے تبادلہ کا اختیار رہے گا، تو اس کی یہ شرط معتبر ہوگی۔ (۳)

(۳) اسی طرح اگر شرط لگائی کہ: میں خود ہی اس کا منتظم رہوں گا اور اس وقف کے تحت معلّمین وائمہ کی تقرری یا معزولی وتبدیلی کا مجھے مکمل اختیار ہوگا اور میرے بعد

---

(۱) قال العلامة قاسم قلت: وإذا كان المعنى ما ذكر فما كان من عبارة الواقف من قبيل المفسر لا يحتمل تخصيصا ولا تأويلا يعمل به وما كان من قبيل الظاهر كذلك وما احتمل وفيه قرينة حمل عليها وما كان مشتركا لا يعمل به لأنه لا عموم له عندنا ولم يقع فيه نظر المجتهد لترجح أحد مدلوليه وكذلك ما كان من قبيل المجمل إذا مات الواقف وإن كان حيا يرجع إلى بيانه هذا معنى ما أفاده. اهـ. (البحر الرائق: ۵/۲۶۵، شاملہ)

(۲) قال في الفتح: ... وله أن يخص صنفا من الفقراء ولو كان الوضع في كلهم قربة، ولا شك أن التصدق على أهل الذمة قربة حتى جاز أن يدفع إليهم صدقة الفطر والكفارات عندنا فكيف لا يعتبر شرطه في صنف دون صنف من الفقراء؟ (شامي: ۴/۳۴۳، مطلب في وقف المرتد والكافر، شاملة)

(۳) ولو قال: أرضي هذه صدقة موقوفة أبدا على أن لي أن أستبدل بها أخرى يكون الوقف جائزا استحسانا.... ولو شرط الواقف في الوقف الاستبدال لكل من ولي هذا الوقف صح ذلك (هنديه: ۲/۴۰۰، شاملة)

میری اولاد کو بھی یہ اختیار رہے گا تو اس کی یہ شرط بھی (جب تک کہ اس کے ایفاء میں شریعت کی مخالفت نہ کی جائے) معتبر ہوگی۔[1]

(۴) اسی طرح اگر اس نے یہ شرط لگائی کہ: میں جس پر چاہوں گا اس کی آمدنی صرف کروں گا تو اس کو اختیار ہوگا کہ اس کی آمدنی کو کسی بھی خیراتی مقصد پر خرچ کرے کسی کو مخالفت کا حق نہیں۔[2]

(۵) اسی طرح اگر شرط لگائی کی اس وقف کی آمدنی سے تاحیات یا ایک مقررہ وقت تک میں خود یا میری اولاد یا فلاں شخص متمتع ہوتا رہے گا پھر میری وفات کے بعد یا اس مقررہ وقت کے بعد اس کی آمدنی مدرسہ وغیرہ میں صرف کی جائے تو اس کی اس شرط کی رعایت بھی ضروری ہوگی۔[3]

البتہ وہ شرط جو شریعت کے خلاف ہو مثلاً کہا اس کی آمدنی فلاں جگہ صرف ہوگی جبکہ وہ جگہ معصیت یا شرک کی ہے، یا کہا اس مسجد کا امام فلاں شخص ہی رہے گا حالانکہ اس امام کے عقائد مشرکانہ یا خلاف اہل سنت ہے یا کہا اس مسجد میں قوالی وغیرہ کی محفلیں قائم ہوں گی تو اس قسم کی شرائط بوجہ خلاف شرع ہونے کے باطل ہیں، قابل عمل نہ ہوں گی۔[4]

---

(۱) وفي فتاوى محمد بن الفضل سئل عمن شرط في أصل الوقف الولاية لنفسه ولأولاده، قال: يجوز بالإجماع، كذا في التتارخانية (هنديه: ۲/۴۰۸)

(۲) إذا وقف أرضه على أن يعطي غلتها من شاء جاز الوقف وله المشيئة في صرف الغلة إلى من شاء (هنديه: ۲/۴۰۳، شاملة)

(۳) (وجاز جعل غلة الوقف) أو الولاية (لنفسه عند الثاني) وعليه الفتوى (الدر المختار: ۴/۳۸۴، شاملة) وقف وقفا على الفقراء وشرط فيه أن له أن يأكل ويؤكل مادام حيا فإذا مات كان لولده وكذلك لولد ولده أبدا ما تناسلوا جاز الوقف على هذا الشرط۔ (هنديه: ۲/۳۹۸، شاملة)

(۴) قال في الفتح: ... فإن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع ←

اسی طرح واقف کی وہ شرط جو وقف کے مفاد کے خلاف ہو تو بہ تقاضہ ضرورت اس پر عمل لازم نہ ہوگا۔ علامہ ابن نجیمؒ نے اشباہ میں لکھا ہے کہ ایسے سات مسائل ہیں جن میں واقف کی شرائط واجب العمل نہیں۔

(۱) واقف نے شرط لگائی کہ قاضی اس کے متولی کو معزول نہیں کرسکتا ہے، لیکن متولی غیر اہل ہو تو قاضی معزول کرسکتا ہے۔ (۱)

(۲) واقف نے شرط لگائی کہ موقوفہ زمین یا مکان ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے کرایہ پر دینے کی اجازت نہیں، لیکن لوگ اتنی مختصر مدت کے لئے اجارہ پر آمادہ نہ ہوں یا زیادہ مدت تک دینے میں فقراء کا فائدہ ہو تو قاضی اس شرط کی مخالفت کرسکتا ہے، مگر اس میں متولی کو مخالفت کا حق نہ ہوگا۔ (۲)

(۳) واقف نے شرط لگائی کہ اس وقف کی آمدنی سے اس کی قبر پر قرآن مجید پڑھا جائے تو خاص قبر کی تعیین باطل ہوگی۔ (۳)

(۴) واقف نے شرط لگائی کہ اس وقف کی فاضل آمدنی خاص فلاں مسجد میں مانگنے والوں ہی کو دی جائے تو متولی کو اختیار ہوگا مسجد سے باہر مانگنے والوں کو یا کسی اور مسجد کے مانگنے والوں کو یا جو بھی حاجت مند سائل ہو اس کو دے سکتا ہے۔ (۴)

← وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية (شامي: ۴/ ۳۴۳، مطلب في وقف المرتد والكافر، شاملة)

(۱) الأولى: شرط أن القاضي لا يعزل الناظر فله عزل غير الأهل. (الأشباه والنظائر: ۱۶۳، دار الكتاب العلمية، بيروت لبنان)

(۲) الثانية: شرط أن لا يؤجر وقفه أكثر من سنة والناس لا يرغبون في استجاره سنة أو كان في الزيادة نفع للفقراء، فللقاضي المخالفة دون الناظر (حوالہ سابق)

(۳) الثالثة: لو شرط أن يقرأ على قبره فالتعيين باطل. (حوالہ سابق)

(۴) الرابعة: شرط أن يتصدق بفاضل الغلة على من يسأل في مسجد كذا كل يوم لم يراع شرطه، فللقيم التصدق على سائل غير ذلك المسجد أو خارج ←

(۵) واقف نے شرط لگائی کہ ہر روز مستحقین کو روٹی، گوشت دیا جائے تو متولی کو اختیار ہوگا کہ وہی کھانا دے یا اس کی قیمت تقسیم کرے۔ [۱]

(۶) واقف نے امام کی مخصوص تنخواہ طے کی ہو لیکن وہ تنخواہ امام کو کفایت نہ کرتی ہو تو قاضی کو جبکہ وہ امام عالم متقی ہو اس تنخواہ میں اضافہ کا حق ہوگا۔ [۲]

(۷) واقف نے شرط لگائی کہ اس موقوفہ زمین یا مکان کا کسی اور زمین سے یا مکان وغیرہ سے تبادلہ نہ کیا جائے لیکن تبادلہ وقف کے مفاد میں ہو تو قاضی اس کا تبادلہ کرسکتا ہے۔ [۳]

۵۵۷- **ضابطہ**: (لزوم میں) وقف اعتاق کے مثل ہے، نہ کہ مثل صدقہ کے۔

تشریح: یہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے اور یہی مفتی بہ ہے [جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک وقف مثل صدقہ کے ہے] [۴] پس اس پر یہ مسائل متفرع ہوں گے:

تفریعات:

(۱) شیء موقوفہ کو حاکم یا متولی کو سپرد کرنا ضروری نہیں، اور نہ رجسٹرڈ کرانا ضروری

← المسجد، أو علی من لا یسأل. (حوالۂ سابق)

(۱) الخامسة لو شرط للمستحقین خبزا أو لحما معینا کل یوم فللقیم أن یدفع القیمة من النقد، وفي موضع آخر لهم طلب العین وأخذ القیمة. (حوالۂ سابق)

(۲) السادسة: تجوز الزیادة من القاضي علی معلوم الإمام إذا کان لا یکفیه وکان عالما تقیا۔ (حوالۂ سابق)

(۳) السابعة: شرط الواقف عدم الاستبدال، فللقاضي الاستبدال إذا کان أصلح۔ (حوالۂ سابق)

(۴) هذا بیان شرائطه الخاصة علی قول محمد لأنه کالصدقة، واختلف الترجیح، والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل بحر وفي الدرر وصدر الشریعة وبه یفتی وأقره المصنف. (الدر المختار) وفي الشامیة: لکن في الفتح أن قول أبي یوسف أوجه عند المحققین۔ (شامي: ۴/ ۳۵۱، شاملة)

ہے، صرف اتنا کہہ دیا کہ مثلاً یہ زمین میں نے مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف کردی تو وقف صحیح ہوگیا، پس جس طرح عتق اور جمیع اسقاطات محض قول سے صحیح ہوجاتے ہیں وقف بھی صحیح ہوجائے گا۔ اور سپرد نہ کرنے کی صورت میں واقف خود ہی اس کا متولی سمجھا جائے گا۔(۱)

(۲) وقف مشاع جائز ہے، یعنی مشترک جائداد میں سے تقسیم کئے بغیر اپنے حصہ کا وقف کیا تو جائز ہے پھر اپنا حصہ غیر کے حصے سے علاحدہ کردیا تو شرعاً وہ وقف تام بھی ہوگیا متاخرین نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

اور یہ مسئلہ درحقیقت اول مسئلہ پر متفرع ہے چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: کہ مشاع کے سلسلہ میں صاحبین کا اختلاف تسلیم اور عدم تسلیم پر مبنی ہے کیونکہ تسلیم اس کے اتمام میں سے ہے، امام ابویوسفؒ کے نزدیک چونکہ تسلیم (یعنی متولی کو سپرد کرنا) شرط نہیں اس لئے مشاع کا وقف جائز ہے اور امام محمدؒ نے تسلیم کو شرط قرار دیا ہے اس لئے ان کے نزدیک مشاع کا وقف جائز نہیں اھ [فتویٰ دونوں قولوں پر ہے لیکن فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ: متاخرین نے امام ابویوسف کا قول فتویٰ کے لئے اختیار کیا ہے](۲)

---

(۱) (قوله: وجعله أبو يوسف كالإعتاق) فلذلك لم يشترط القبض والإفراز. اهـ. ح: أي فيلزم عنده بمجرد القول كالإعتاق بجامع إسقاط الملك۔ وفي القهستاني: أن التسليم ليس بشرط إذا جعل الواقف نفسه قيما۔ (شامی: ۳۴۸/۴، ۳۴۹، شاملة) رجل وقف وقفا ولم يذكر الولاية لأحد قيل: الولاية للواقف، وهذا على قول أبي يوسف - رحمه الله تعالى -؛ لأن عنده التسليم ليس بشرط (هنديه: ۴۰۸/۲)

(۲) والخلاف في وقف المشاع مبني على اشتراط التسليم وعدمه لأن القسمة من تمامه فأبو يوسف أجازه لأنه لم يشترط التسليم ومحمد لم يجزه ←

واضح رہے کہ یہ اختلاف مسجد اور قبرستان کے علاوہ وقف میں ہے، مسجد اور قبرستان کے وقف میں بالاتفاق وقف مشاع جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا ضروری ہے اور شرکت کا بقاء اس خلوص کو مانع ہے۔

نیز یہ اختلاف قابل تقسیم شیء میں ہے جو چیز نا قابل تقسیم ہو جیسے چھوٹا مکان، کنواں وغیرہ تو چونکہ اس میں تقسیم ممکن نہیں اس لئے اس میں بالاتفاق مشاع کا وقف جائز ہے۔ اور اس صورت میں اس موقوفہ شیء کی آمدنی میں سے واقف کے حصے کی آمدنی وقف شمار ہوگی۔(۱)

۵۵۸-ضابطہ: وقف کا فی الفور ہونا ضروری ہے کسی شرط پر تعلیق صحیح نہیں۔(۲)

تفریع: پس اگر مستقبل کی کسی شرط پر وقف کو معلق کیا مثلاً کہا میں فلاں سے بات کرلوں یا فلاں شخص آجائے تو یہ زمین وقف ہے یا جب آئندہ کل آجائے یا فلاں تاریخ آجائے تو وقف ہے، یا میرے لڑکے کے یہاں اولاد ہو تو یہ زمین اس کی ہے

← لاشتراطه التسليم (شامي: ۳۶۲/۴، مطلب في قف المشاع المقضي به، شاملة) وقف المشاع المحتمل للقسمة لايجوز عند محمد به أخذ مشائخ بخارى وعليه الفتوى، والمتأخرون أفتوابقول أبي يوسف أنه يجوز وهو المختار كذا في خزانة المفتيين (الهنديه: ۳۶۵/۲، فصل في وقف المشاع)

(۱) والخلاف فيما يقبل القسمة، أما ما لا يقبلها كالحمام والبئر والرحى فيجوز اتفاقا إلا في المسجد والمقبرة لأن بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى نهر وفتح (شامي: ۳۴۸/۴ شاملة)

(۲) (وأن يكون) قربة في ذاته معلوما (منجزا) لا معلقا. الخ (الدر المختار: ۴/ ۳۴۱، شاملة)

ورنہ فلاں مسجد یا مدرسہ کو وقف ہے تو اس طرح وقف نافذ نہ ہوگا کیونکہ وقف بھی مثل ہبہ کے تعلیق بالخطر کا احتمال نہیں رکھتا ہے اس کا منجز اور فی الفور ہونا ضروری ہے۔ (۱)

استدراک: لیکن وقف معلق بالموت صحیح ہے یعنی اگر کہا کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین یا یہ مکان وقف ہے تو یہ وقف درست ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ درحقیقت وقف نہیں ہے بلکہ وصیت بالوقف ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسا وقف صرف میت کے تہائی مال سے نافذ کیا جاتا ہے اور ایسے وقف کو واقف رجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے رجوع سے وہ وقف باطل ہو جاتا ہے جیسا کہ وصیت کا حکم ہے۔ (۲)

۵۵۹- **ضابطہ**: اشیاء منقولہ کا وقف صحیح نہیں، مگر یہ کہ غیر منقول کی تبعیت وضمن میں ہو یا ان کا وقف مروج ہو۔ (۳)

تشریح: تبعیت کی مثال یہ ہے کہ: کھیت کو وقف کیا تو اس کے ضمن میں کھیتی کے آلات بھی وقف کئے تو ضمناً ان آلات کا وقف جائز ہے۔

اور مروج کی مثال: قبر کھودنے کے آلات کا وقف؛ جنازہ اٹھانے کے تابوت کا وقف؛ مسجد میں قرآن مجید، چٹائیاں، فانوس وغیرہ کا وقف؛ مدرسہ میں کتابوں وغیرہ

(۱) (قوله: لا معلقا) كقوله: إذا جاء غد أو إذا جاء رأس الشهر أو إذا كلمت فلانا فأرضي هذه صدقة موقوفة أو إن شئت أو أحببت يكون الوقف: باطلا لأن الوقف لا يحتمل التعليق بالخطر لكونه مما لا يحلف به كما لا يصح تعليق الهبة (شامي: ۳۴۱/۴ مطلب قد يثبت الوقف بالضرورة، شاملة)

(۲) (أو بالموت إذا علق به) أي بموته كإذا مت قد وقفت داري على كذا فالصحيح أنه كوصية تلزم من الثلث بالموت لا قبله. (الدر المختار) وفي الشامية: وله أن يرجع قبل موته كسائر الوصايا، وإنما يلزم بعد موته بحر، ومثله في الفتح. (شامي: ۳۴۴/۴، شاملة)

(۳) (الدر المختار: ۳۶۱/۴)؛ البحر الرائق: ۲۱۸/۵)

کا وقف؛ کہ ان چیزوں کا وقف مروج و معروف ہے اس لئے جائز ہے۔[۱]

۵۶۰-ضابطہ: وہ چیز جس کا انتفاع اس کے عین کے بقاء کے ساتھ ممکن نہیں اس کا وقف درست نہیں۔[۲]

تفریع: پس دراہم دنانیر، روپے پیسے، کھانے پینے کی اشیاء اور دواؤں وغیرہ کا وقف صحیح نہیں کیونکہ ان کے عین کے بقاء کے ساتھ انتفاع ممکن نہیں۔[۳]

۵۶۱-ضابطہ: اصل وقف پر شہادت بالتسامع جائز ہے، شرائط و مصارف وقف پر شہادت بالتسامع جائز نہیں۔[۴]

تشریح: پس اگر کوئی پرانا وقف ہو جس کے واقف کا کچھ علم نہ ہو اور اس پر کوئی شخص دعویٰ کر دے تو اس صورت میں اثبات وقف کے لئے شہادت بالتسامع والشہرۃ مقبول ہے، بلکہ اثبات وقف میں تو یہاں تک گنجائش ہے کہ عند القاضی شہادت

---

(۱)(ولو وقف العقار ببقره وأكرته) بفتحتين عبيده الحراثون (صح) استحسانا تبعا للعقار (الدر المختار: ۳۶۱/۴، مطلب في وقف المنقول تبعاً للعقار، شاملة) وعن محمد جواز وقف ما جرى فيه التعامل كالفأس والقدوم والمنشار والقدور والجنازة والمصاحف والكتب، بخلاف ما لا تعامل فيه والفتوى على قول محمد (الاختيار لتعليل المختار: ۴۳/۳ شاملة، تاتارخانية، جديد: ۲۷/۸، ۲۸، م: زكريا ديوبند)(۲)(ہندیہ: ۳۶۲/۲)

(۳)وأما وقف ما لا ينتفع به إلا بالإتلاف كالذهب والفضة والمأكول والمشروب فغير جائز في قول عامة الفقهاء، والمراد بالذهب والفضة الدراهم والدنانير وما ليس بحلي كذا في فتح القدير۔ (هنديه: ۳۶۲/۲، شاملة)

(۴) وفي الوقف أنها تقبل بالتسامع على أصله لا على شرائطه وهو الصحيح (مجمع الانهر: ۱۹۳/۲، شاملة)و في الإسعاف والخانية لا يجوز الشهادة على الشرائط والجهات بالتسامع اهـ ولا يخفى أن الجهات هي بيان المصارف (شامي: ۴۱۴/۴، شاملة)

بالتسامع کی صراحت بھی صحیح ہے یعنی دو شخص قاضی کے پاس جاکر کہے کہ ہم دونوں لوگوں سے سن کر اور شہرت کی بنا پر شہادت دیتے ہیں کہ یہ زمین یا یہ مکان وقف کا ہے تو باوجود اس تصریح کے شہادت جائز ہے جبکہ دیگر وہ مسائل جن میں شہادت بالتسامع جائز ہے جیسے نسب، نکاح، موت وغیرہ ان میں شرط ہے کہ عند القاضی اس کی تصریح نہ کرے کہ یہ شہادت محض تسامع سے ہے۔

پس حاصل یہ کہ وقف میں جب واقف کا علم نہ ہو اور کوئی شخص اس وقف پر ملکیت کا دعویٰ کردے تو اس کے خلاف شہادت بالتسامع جائز ہے مگر موقوف علیہ (یعنی یہ کس پر وقف کیا گیا ہے) کا علم ضروری ہے، یہ حکم اصل وقف میں ہے۔ شرائط ومصارف وقف پر شہادت بالتسامع جائز نہیں۔ (۱)

اور شرائط سے مراد واقف کی بیان کردہ شرائط ہیں جیسے وقف کی آمدنی سے اتنا فلاں مدرسہ کے لیے ہوگا اور اتنا عام فقراء کیلئے ہوگا یا اس کا متولی فلاں شخص ہوگا یا اس مسجد کا امام فلاں خاندان سے رہے گا وغیرہ جو کچھ واقف نے صراحت کیا ہو یا وقف نامہ میں لکھا ہو، نہ کہ وہ شرائط جن پر صحت وقف موقوف ہیں مثلاً واقف کا عاقل، بالغ ہونا، شیءِ موقوفہ کا اس کی ملکیت میں ہونا وغیرہ کیونکہ وہ تو اصل وقف میں داخل ہیں، چنانچہ فقہاء نے یہاں اصل وقف اور شرائط کی تمیز میں اصول بیان کیا ہے کہ: "وقف سے متعلق ہر وہ چیز جو صحت وقف سے متعلق ہو اور صحت وقف اس پر موقوف ہو وہ اصل

---

(۱) وفي الشامية معزيا الى الخيرية: وقف قديم مشهور لا يعرف واقفه استولى عليه ظالم فادعى المتولي أنه وقف على كذا مشهور وشهدا بذلك فالمختار أنه يجوز (شامی: ۴/۴۱۱، شاملہ) وهذا بخلاف ما تجوز فيه الشهادة بالتسامع فإنها إذا صرحا به لا تقبل اهـ أي بخلاف غير الوقف من الخمسة المارة فإنه لا يتيقن فيها بأن الشهادة بالتسامع فيفرق فيها بين السكوت والإفصاح والحاصل: أن المشايخ رجحوا استثناء الوقف منها للضرورة: وهي حفظ الأوقاف القديمة عن الضياع ولأن التصريح بالتسامع فيه لا يزيد على الإفصاح به (شامی: ۴/۴۱۲، شاملہ)

وقف میں سے ہے اور جس پر صحت وقف موقوف نہ ہو وہ شرائط میں سے ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ صحت وقف کی شرائط تو وقف کے لئے موقوف علیہ ہیں، لہٰذا وہ اصل وقف میں داخل ہیں اور ان میں شہادت بالتسامع جائز ہے۔

مستثنیٰ دراصل واقف کی شرائط ہیں جو نہ صحت وقف سے متعلق ہیں اور نہ ان پر صحت وقف موقوف ہیں پس ان میں شہادت بالتسامع جائز نہیں یہی اصح ہے اور ہندیہ میں سراجیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے۔ (۱)

ہاں لیکن جہاں شرائط واقف کے متعلق التباس واشتباہ ہو جائے اور ثبوت کسی جہت میں قطعی نہ ہو تو سابقہ زمانہ میں اس سلسلہ میں جو عمل چلا آرہا ہو اسی پر حکم کو مبنی کیا جائے گا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا مثلاً وقف نامہ میں لکھا ہو کہ اس وقف کی آمدنی ''مسجد دارالسلام'' میں صرف کی جائے اور اس نام کی دو مسجدیں ہوں ایک واقف کی بستی سے بہت دور ہو اور دوسری مسجد قریب ہو، تو جو قریب ہے اس کی قربت کا تقاضہ ہے کہ وہی مراد ہوگی لیکن وقف نامہ میں اس کی تعیین نہیں اور نہ اس پر کوئی گواہ ہے بلکہ لوگوں کا عمل اس کے خلاف ہے یعنی اب تک دور والی مسجد میں اس کی آمدنی صرف کرتے چلے آرہے ہیں تو اسی سابقہ عمل کو ہی برقرار رکھا جائے گا، کیونکہ مسلمانوں کے احوال سے یہی ظن غالب ہے کہ واقف کی شرائط پر وہ صحیح کاربند ہوں گے۔ (۲)

(۱) و كل ما يتعلق بصحة الوقف وتتوقف عليه فهو من أصله وما لا تتوقف عليه الصحة فهو من الشرائط (مجمع الانہر: ۲/۱۹۳، شاملہ) فالمراد من الشرائط ما يشترطه الواقف في كتاب وقفه لا الشرائط التي يتوقف عليها صحة الوقف كالملك والإفراز والتسليم عند القائل به ونحو ذلك مما مر أول الباب (شامی: ۴/ ۴۱۲) (لا) تقبل بالشهرة (ل) لإثبات (شرائطه في الأصح) (الدر المختار) وفي الشامية: (قوله: في الأصح) وعليه الفتوى هندية عن السراجية ط (شامی: ۴/ ۴۱۲، شاملہ)

(۲) وأيضا قولهم المجهولة شرائطه ومصارفه يفهم منه أن ما لم يجهل منها يعمل بما علم منها، وذلك العلم قد لا يكون بمشاهدة الواقف بل بالتصرف ←

۵۶۲-**ضابطہ:** علماء کے اختلاف کی صورت میں جب ترجیح ممکن نہ ہوتو ہر اس قول پر فتویٰ دیا جائے گا جس میں وقف کا نفع وفائدہ زیادہ ہو۔ (۱)

جیسے وقف کو ایک مدت تک کے لئے کرایہ پر دیا پھر مدت اجارہ میں بازار میں اس جیسی چیز کا عام کرایہ مقدار فحش کے ساتھ بڑھ گیا تو اجارہ کے فسخ کا فتویٰ دیا جائے گا کہ اس میں وقف کا نفع اور فائدہ ہے۔ (۲)

← القديم، وبه صرح في الذخيرة حيث قال سئل شيخ الإسلام عن وقف مشهور اشتبهت مصارفه وقدر ما يصرف إلى مستحقيه قال: ينظر إلى المعهود من حاله فيم سبق من الزمان من أن قوامه كيف يعملون فيه وإلى من يصرفونه، فيبنى على ذلك لأن الظاهر أنهمكانوا يفعلون ذلك على موافقة شرط الواقف وهو المظنون بحال المسلمين فيعمل على ذلك اهـ فهذا عين الثبوت بالتسامع وفي الخيرية إن كان للوقف كتاب في ديوان القضاة المسمى في عرفنا بالسجل، وهو في أيديهم اتبع ما فيه استحسانا إذا تنازع أهله فيه وإلا ينظر إلى المعهود من حاله فيما سبق من الزمان من أن قوامه كيف كانوا يعملون (شامی: ۴/ ۴۱۲، شاملہ)

(۱) الفتوى إذا اختلفت كان الترجيح لظاهر الرواية، وفيه من باب المصرف: إذا اختلف التصحيح وجب الفحص عن ظاهر الرواية والرجوع إليها، وكذا لو كان أحدهما أنفع للوقف لما سيأتي في الوقف والإجارات أنه يفتي بكل ما هو أنفع للوقف فيما اختلف العلماء فيه (شامي: ۱/ ۷۲، مقدمه، شاملة)

(۲) وكذا يفتى بكل ما هو أنفع للوقف) فيما اختلف فيه العلماء حتى نقضوا الإجارة عند الزيادة الفاحشة نظرا للوقف وصيانة لحق الله تعالى حاوي القدسي. (الدر المختار: ۶/ ۲۱، شروط الاجارة، شاملة) يفتى بكل ما هو أنفع للوقف مما اختلف العلماء فيه وبنوا عليه تصحيح القول بفسخ الإجارة لزيادة أجر المثل في المدة كما مر (شامي: ۶/ ۳۲، شاملة)

الخرائط الثمينة في المسائل الفقهية المهمة

یعنی

اہم فقہی مسائل کے قیمتی شجرات

شجرہ (۱): خبر کی اقسام

پیچھے صفحہ کا

امور غیر ملزمہ میں

ان امور میں جو من وجہ ملزم اور من وجہ غیر ملزم ہیں

یعنی جن میں کوئی الزام نہ ہو جیسے وکالت یا ارسال ہدیہ وغیرہ کی خبر دینا مثلاً میں فلاں کا بیع میں وکیل ہوں یا کوئی چیز دے کر کہنا فلاں نے آپ کو یہ چیز ہدیہ کی ہے یا عاریت پر دی ہے وغیرہ

جیسے وکیل کو معزول کرنا یا عبد ماذون کو مجور کرنا (پس وکیل کو معزول کرنے اور ماذون کو تجارت سے منع کرنے کے اعتبار سے الزام کا معنی ہے اور اس اعتبار سے کہ مالک خالص اپنے حق میں تصرف کر رہا ہے کوئی الزام نہیں)

ان میں شہادت ضروری نہیں صرف ایک باتمیز شخص کی خبر کافی ہے خواہ وہ مخبر عادل ہو یا غیر عادل مسلمان ہو یا کافر بالغ ہو یا نابالغ سمجھدار بچہ

اس میں عدد یا عدالت دونوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں مخبر یا عادل شخص ہو یا عادل نہ ہو تو خبر دینے والے کم از کم دو افراد ہوں

(۱) دیانات سے مراد دیانات محضہ ہے یعنی جس میں خبر سے کسی کی ملکیت زائل کرنا یا کسی پر کوئی الزام نہ ہو پس خبر رضاعت سے احتراز ہو گیا کہ اس میں ملک متعہ کا زوال ہے اس لئے اس میں دو عادل شخصوں کا ہونا ضروری ہے و التفصیل فی الشامیۃ ۹/۴۹۸

نوٹ: حوالجات کتاب میں ''باب الاخبار'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

شجرہ (۲): اقرار کا بیان

شجرہ (۳): مضاربت کا بیان

آگے صفحہ پر

پچھلے صفحہ کا
شرائط مضاربت(۲)
للصحۃ
للبقاء
عاقدین میں وکیل بنانے یا خود وکیل بننے کی صلاحیت ہو پس نابالغ سے یہ عقد جائز نہیں اور غیر مسلم سے جائز ہے
سرمایہ کرنسی کی صورت میں ہو (مگر بوقت ضرورت سامان میں بھی گنجائش ہے تفصیل کتاب میں)
مال مضاربہ متعین ومعلوم ہوں
مال نقد ہو نہ کہ دین یعنی یہ نہ کہا کہ تمہارے ذمہ جو دین ہے اس میں عقد کرو
سرمایہ پر مضارب کا مکمل قبضہ ہو
نفع کا تناسب متعین کیا گیا ہو مثلاً نصف، ثلث وغیرہ، لگی بندھی رقم متعین نہ کی گئی ہو
فریقین میں سے ہر ایک کا اس عقد کو برقرار رکھنا کیونکہ یہ عقد غیر لازم ہے کوئی بھی ایک فسخ کر سکتا ہے
فریقین میں سے کسی کی موت واقع نہ ہونا۔ کہ موت سے عقد ختم ہو جاتا ہے
کسی کا دماغی توازن متاثر نہ ہونا
سامان خریدنے سے قبل اصل سرمایہ کا ضائع نہ ہونا ورنہ عقد باطل ہو جاتا ہے
مسلم ملک میں سرمایہ کار کا اسلام سے مرتد نہ ہونا۔
آگے صفحہ پر

پچھلے صفحہ کا
حقوق مضارب (۳)
مضاربت صحیحہ میں
مضاربت فاسدہ میں
اس میں مضارب صرف اجرت مثل کا مستحق ہوگا اور کوئی حق ثابت نہ ہوگا
حق نفع
حق نفقہ
ظاہر ہے نفع میں وہ شریک ہوگا لیکن معاملہ ختم ہونے کے بعد اس کا مستحق ہوگا اس سے قبل تقسیم عمل میں آئی تو نقصان ہونے پر تقسیم شدہ نفع سے بھرپائی کی جائے گی
دوا علاج
کھانا وغیرہ
وہ جائز نہیں، یعنی اس کا خرچ وہ مال مضاربہ میں سے نہیں لے سکتا
سفر میں
حضر میں
سفر میں مضارب کرایہ، کھانے، کپڑے کی دھلائی وغیرہ کے نفقہ کا مستحق ہے لیکن اولاً یہ خرچ مشترک نفع میں محسوب ہوگا اس کے بعد راس المال میں
حضر کے نفقہ کا وہ مستحق نہیں (کسی شہر میں اس کے بیوی بچے موجود ہوں اور سفر کرکے وہاں جائے تو اس میں قیام بھی حکماً حضر ہوگا)
نوٹ: حوالجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

شرکت

شجرہ(۴): شرکت کا بیان

شرکت اموال

دو یا تین افراد کا سرمایہ ہو اور کاروبار کر کے باہم مال طے شدہ یا مال کے تناسب سے نفع تقسیم کریں

شرکت اعمال

دو مل کر کسی کام میں معاہدہ کریں کہ ہم کپڑا سییں گے یا دھوئیں گے یا ایک دھوئے گا اور دوسرا سیے گا اور جو نفع ہو وہ مقررہ تناسب سے تقسیم ہوگا

شرکت وجوہ

ایک دوسرے کی شخصی وجاہت اور معاملاتی ساکھ سے استفادہ کریں اور طے ہو کہ ادھار خرید کر نقد بیچیں گے اور نفع میں شریک رہیں گے

شرکت مفاوضہ

دو شخص اس طرح شریک ہوں کہ دونوں کا سرمایہ مساوی ہو اور تصرف کا حق بھی مساوی ہو اور نقصان وتجارتی واجبات میں دونوں ایک دوسرے کے ذمہ دار بھی ہوں، گویا حقوق کے تصرف میں دونوں ایک دوسرے کے وکیل اور ضمان وذمہ میں ایک دوسرے کے کفیل ہوں (۱)

شرکت عنان

دو شخص کا مشترک سرمایہ ہو خواہ مساوی ہو یا کم وبیش، اور معاہدہ ہو کہ تجارت کر کے مقررہ تناسب سے مابین نفع تقسیم کریں گے۔ اس میں سرمایہ نیز حق تصرفات میں مساوات ضروری نہیں، اور نہ ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد ہوتی ہے۔ یہ قسم بالاتفاق جائز ہے اور اس کا وقوع بکثرت ہے برخلاف مفاوضہ کے۔ (۲)

آگے صفحہ پر

پچھلے صفحہ کا

شرائط(۳)

۱- شرکاء میں وکیل بننے کی صلاحیت ہو (پس مجنون اور ناسمجھ بچہ کو شریک بنانا درست نہیں اور غیر مسلم کو بنانا درست ہے)

۲- عمومی مباحات مثلاً شکار جنگل کے غیر مملوکہ پودے وغیرہ میں شرکت نہ ہو۔ کیونکہ ان میں توکیل درست نہیں جبکہ شرکت کی بنیاد توکیل پر ہے۔

۳- سرمایہ متعین و موجود ہو (کہ دین اور غیر موجود میں مال میں شرکت درست نہیں)

۴- نفع فیصداً متعین ہو مثلاً تہائی چوتھائی وغیرہ، معین رقم نہ ہو

۵- غیر عامل شریک کا نفع اس کے مال کے تناسب سے زیادہ نہ ہو یعنی اس کا مال نصف ہو تو نفع میں بھی شرکت نصف سے زائد نہ ہو

تصرفات(۴)

۱- شریک عامل سرمایہ امانت پر رکھ سکتا ہے۔

۲- عاریت پر بھی رکھ سکتا ہے

۳- سرمایہ بضاعت پر لگا سکتا ہے (بضاعت کہتے ہیں: کسی سے اس طرح معاملہ کرنا کہ عامل کچھ نہ لے اور پورا نفع صاحب سرمایہ کو دیدے)

آگے صفحہ پر

نوٹ: حوالجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

شجرہ (۵): مزارعت کا بیان

ارکان مزارعت

زمین — بیج — آلۂ کاشت — عمل

اقسام واحکام(۱)

۱-زمین، بیج، آلۂ کاشت مالک کی طرف سے ہو؛ عمل مزارع کی طرف سے

۲- زمین مالک کی طرف سے ہو؛ بیج، آلۂ کاشت عمل مزارع کی طرف سے

۳-زمین، بیج مالک کی طرف سے ہو؛ عمل، آلۂ کاشت مزارع کی طرف سے

حکم: جائز ہے

۴-زمین، آلۂ کاشت مالک کی طرف سے ہو؛ بیج عمل مزارع کی طرف سے ہو

۵-زمین، عمل مالک کی طرف سے ہو؛ بیج، آلۂ کاشت مزارع کی طرف سے ہو

۶- زمین، عمل، آلۂ کاشت مالک کی طرف سے ہو؛ بیج مزارع کی طرف سے

حکم: ظاہر الروایت میں جائز نہیں، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے

فائدہ: بیج میں مالک زمین اور مزارع کی شرکت جائز نہیں مکمل بیج مالک یا مزارع کی جانب سے ہونا ضروری ہے (اگر مزارع کو کل بیج کی استطاعت نہ ہو اور وہ شرکت ہی چاہتا ہو تو جواز عقد کیلئے مالک اس کو نصف بیج قرض یا ہدیہ یا کم قیمت میں دیدے)(۲)

نوٹ: حوالجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

یمین
شجرہ (۶): اقسام یمین باعتبار زمان
مستقبل سے متعلق ہو
ماضی وحال سے متعلق ہو
آئندہ کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق قسم کھانا
اپنی دانست میں خود کو سچ جانتے ہوئے ماضی یا حال کی کسی بات پر قسم کھانا حالانکہ وہ اس میں جھوٹا ہو
ماضی یا حال سے متعلق کسی واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے کی عمداً جھوٹی قسم کھانا
حکم
اس کو یمین لغو کہا جاتا ہے
ممکنات میں سے نہ ہو
وہ فعل ممکنات میں سے ہو
جیسے قسم بخدا میں نہیں مروں گا، یا آج سورج غروب نہ ہوگا، یا تمہارے لئے فلاں ستارہ یا چاند توڑ کر لاؤں گا وغیرہ
جیسے میں فلاں کھانا نہیں کھاؤں گا یا فلاں سے بات نہیں کروں گا وغیرہ
اس میں گناہ لازم نہیں اور نہ کوئی کفارہ واجب ہے (۱)
اس کو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے
حکم
اس میں حانث ہونے پر استغفار کے ساتھ قسم کا کفارہ بھی واجب ہے (۲)
اس کو یمین غموس کہا جاتا ہے
حکم
نوٹ: حوالجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں
اس میں توبہ استغفار واجب ہے کفارہ کچھ لازم نہیں (۳)

شجرہ (۷): اقسام یمین باعتبار اطلاق وتقیید

مطلق: جس میں کسی وقت یا مدت کی صراحتاً یا دلالتاً کوئی قید نہ لگائی گئی ہو

- **مثبت ہو:** جیسے بخدا میں یہ روٹی ضرور کھاؤں گا
  - جب تک حالف اور محلوف علیہ (روٹی) موجود ہو حانث نہیں ہوگا اگر حالف فوت ہوجائے یا محلوف علیہ ضائع ہوجائے تو حانث ہوجائے گا اور کفارہ لازم ہوگا(۱)
- **منفی ہو:** جیسے بخدا میں یہ روٹی نہیں کھاؤں گا
  - اس میں حالف یا محلوف علیہ (روٹی) دونوں میں سے کوئی ایک ہلاک وضائع ہوجائے تو یمین ختم ہوجائے گی اور حانث نہ ہوگا(۲)

مقید: جس میں وقت یا زمانہ کی قید موجود ہو

- **صراحتاً قید ہو:** جیسے میں آج یہ روٹی کھا کر رہوں گا
  - اس میں حالف، محلوف علیہ اور مقررہ وقت باقی ہو تو حانث نہ ہوگا: اگر وقت ختم ہوجائے اور یہ دونوں باقی ہوں تو بالاتفاق حانث ہوجائے گا: اگر وقت موجود ہو اور حالف بھی باقی ہو لیکن محلوف علیہ نہ رہے تو یہ قسم باطل وکالعدم ہوگی البتہ امام ابویوسف کے نزدیک باقی رہے گی وقت گزرنے پر حانث ہوجائے گا(۳)
- **دلالتاً قید ہو:** جیسے بیوی گھر سے باہر نکل رہی تھی شوہر نے غصے میں کہا اگر باہر قدم رکھا تو تین طلاق
  - پس گویہ مطلق یمین ہے لیکن اس میں دلالت حال سے فوری وقت مراد ہوگا پس فوراً نکلی تو طلاق واقع ہوگی اور اگر کچھ دیر بیٹھ گئی پھر نکلی تو واقع نہ ہوگی اس کو **یمین فور** کہتے ہیں(۴)

نوٹ: حوالجات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

شجرہ(۸):نذرکابیان

نذر

مطلق

جوکسی شرط پر معلق نہ ہو

جیسے کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کے واسطہ ایک سال کے روزے واجب ہیں اوران کوکسی شرط پر معلق نہیں کیا اس کو نذر منجز اور نذر مرسل بھی کہا جاتا ہے

حکم

اس میں منذور بہ یعنی جس کی نذر مانی ہو مثلاً روزہ وغیرہ کا بعینہ ادا کرنا ضروری ہے اس میں کوئی کفارہ کافی نہ ہوگا

مقید

جوکسی شرط پر معلق ہو

ایسی شرط پر معلق ہوکہ ناذراس شرط کے وجود کی امید وتمنی کرتا ہے یعنی جلب منفعت یادفع مضرت کے قبیل سے کوئی شرط ہو

مثلاً کہا اگر اللہ نے میرے مریض کوشفاء دی یامیرے غائب کولوٹادیاتومیں ایک سال کا روزہ رکھوں گایاحج کروں گا اس نذرکو''نذرتردد'' کہتے ہیں

ایسی شرط ہوکہ ناذراس کے وقوع کونہیں چاہتا ہے

مثلاً غصہ میں کہہ دیاکہ اگرمیں فلاں سے بات کروں تومجھ پردس ہزار روپیہ صدقہ حالانکہ وہ چاہتا ہے کہ اس سے بات کرے اس نذرکو ''نذرلجاج'' کہاجاتا ہے

حکم

اس میں ناذرکواختیار ہے کہ وجودشرط کے بعد خواہ منذوربہ کوادا کرے یاقسم کا کفارہ دے

نوٹ:حوالجات کتاب میں ''کتاب النذر'' میں ملاحظہ فرمائیں

لقطہ

- **جس میں جلد فساد طاری ہو جاتا ہو**
  - جیسے سیب ، امرود وغیرہ اشیائے خوردنی جو پانی میں بہہ کر جا رہی ہوں
    - **حکم**: ان کو نکال کر کھا سکتے ہیں کیونکہ ان میں فساد طاری ہو جاتا ہے اور نہ نکالیں گے تو بگڑ کر یوں ہی برباد ہو جائیں گی
- **جس میں جلد فساد طاری نہ ہوتا ہو**
  - **جسے لوگ عادتاً پھینکتے نہ ہوں**
    - **قابل قیمت ہو**
      - **حکم**: یہ لقطہ ہے مالک تک پہنچانا ضروری ہے اگرچہ وہ چیز منتشر ہو اور ایک ایک جمع کر کے قابل قیمت ہوئی ہو۔
    - **قابل قیمت نہ ہو**
      - **حکم**: اس میں اعلان ضروری نہیں خود کام میں لا سکتا ہے تاہم مالک آکر مانگے تو دینا ضروری ہے
  - **جسے لوگ عادتاً پھینک دیتے ہوں**
    - جیسے کھجور، آم وغیرہ کی گٹھلیاں ، پانی کولڈ ڈرینک وغیرہ کی بوتلیں اور سبزی مارکیٹ میں گری پڑی سبزیاں وغیرہ جنہیں لوگ عادتاً پھینک دیتے ہیں
      - **حکم**: یہ لقطہ نہیں اگرچہ کافی مقدار میں جمع کرنے کے بعد یہ چیزیں قابل قیمت ہوگئی ہوں پس انہیں استعمال کر سکتا ہے

نوٹ: حوالجات کتاب میں ''کتاب اللقطہ'' میں ملاحظہ فرمائیں

شجرہ (۱۰): وقف کا بیان

شرائط وقف

للواقف

۱- واقف عاقل ہو، فاتر العقل کا وقف صحیح نہیں

۲- بالغ ہو، نابالغ کا وقف صحیح نہیں

۳- آزاد ہو، غلام کا وقف صحیح نہیں

۴- بعض علماء کے نزدیک مسلمان ہو، لیکن صحیح یہ ہے کہ کافر کا وقف بھی صحیح ہے (تفصیل کتاب میں ہے)

للموقوف علیہ

اس میں وقف کا مصرف بننے کی صلاحیت ہو یعنی شرعاً وہ قربت اور ثواب کا مقام ہو خواہ فرد واحد پر وقف ہو جیسے زید، عمر، بکر یا جماعت پر ہو جیسے علماء، فقہاء، فقراء یا غیر ذی روح پر ہو جیسے مسجد، مدرسہ وغیرہ۔ پس مندر، گرجا گر وغیرہ معصیت کی چیزوں کیلئے وقف درست نہیں

لتعبیر الوقف

۱- وقف منجز ہو، کسی شرط پر معلق نہ ہو مثلاً فلاں کی اجازت ہو تو وقف ہے ورنہ نہیں اس طرح وقف صحیح نہیں

۲- وقف ہمیشہ کیلئے ہو محدود مدت سال دو سال کیلئے وقف صحیح نہیں

۴- میں جب چاہوں گا اس کو بیچ دوں گا یا کسی کو ہدیہ کر دوں گا وغیرہ کوئی ایسی شرط اس میں نہ ہو جس سے وقف کا مقصد فوت ہو جائے

۵- اس میں خیار شرط نہ ہو یعنی جب چاہوں گا رجوع کر لوں گا یہ اختیار نہ رکھا ہو

للشیء الموقف

آگے صفحہ پر

۱-شی ءموقوفہ مال متقوم ہو، پس جو چیز غیر متقوم ہو یا شرعاً جو مال نہ ہو اس کا وقف صحیح نہیں

۲-غیر منقولہ: زمین عمارت وغیرہ ہو۔ منقول اشیاء کا وقف صحیح نہیں، مگر یہ کہ غیر منقول کے ضمن میں ہو یا اس کا وقف مروج ہو

۳- وہ شی ءمعلوم و متعین ہو، پس مطلق یہ کہنا کہ میں زمین وقف کرتا ہوں کافی نہیں اس کے مقام اور حدود کی تعیین لازم ہے مگر یہ کہ مشہور جگہ ہو اور حدود معین ہوں

۴-واقف بوقت وقف اس کا مالک ہو، بعد میں مالک ہوا تو کافی نہیں وہ وقف صحیح نہ ہوگا

۵-ایسی چیز ہو کہ اس کا انتفاع اس کے عین کے بقاء کے ساتھ ممکن ہو۔ پس دراہم، دنانیر، کھانے پینے کی اشیاء اور دواؤں وغیرہ کا وقف صحیح نہیں

۶-امام محمدؒ کے نزدیک قابل تقسیم شی ءہو تو علاحدہ ہو مشترک نہ ہو، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مشترک (مشاع) میں سے اپنے حصے کا وقف بھی صحیح ہے فتویٰ اسی پر ہے لیکن مسجد اور قبرستان کیلئے بالاتفاق وقف مشاع جائز نہیں (تفصیل کتاب میں ہے)

مستفاد: شامی، بدائع، بحر، ھندیہ وغیرھا من الکتب المستندۃ

حوالجات شجرات

حوالجات شجره (۳): مضاربت کا بیان

(۱) انظر تخریجه تحت ضابطة: ۵۱۴

(۲) (أما) الذي يرجع إلى العاقدين وهما رب المال والمضارب، فأهلية التوكيل والوكالة؛ (بدائع: ۸۱/۶، شاملة) (وشرطها) أمور سبعة (كون رأس المال من الأثمان) (الدر المختار: ۶۴۷/۵) (وكونه عينا لا دينا)..... (وكون رأس المال معلوما) لئلا يقعا في المنازعة.... (وتسليمه إلى المضارب) حتى لا يبقى لرب المال فيه يد... (و) الخامس (كون نصيب المضارب من الربح معلوما عنده) أي عند العقد لأن الربح هو المعقود عليه وجهالته توجب فساد العقد (و) السادس (شيوع الربح بينهما بحيث لا يستحق أحدهما دراهم مسماة) لقطعه الشركة في الربح لاحتمال أن لا يحصل من الربح إلا قدر ما شرط له (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۳۱۱/۲، شاملة) فعقد المضاربة يبطل بالفسخ، وبالنهي عن التصرف... وتبطل بموت أحدهما؛ لأن المضاربة تشتمل على الوكالة، والوكالة تبطل بموت الموكل والوكيل ...وتبطل بجنون أحدهما إذا كان مطبقا...وتبطل بهلاك مال المضاربة في يد المضارب قبل أن يشتري به شيئا في قول أصحابنا (بدائع: ۱۱۲/۶) (تبطل) أي المضاربة (بموت أحدهما)...(ولحوق المالك) بدار الحرب (مرتدا) وحكم القاضي به لأنه كالموت (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۳۱۱/۲)

(۳) انظر تخريجه تحت ضابطة: ۵۱۵

حوالجات شجرہ (۴): شرکت کا بیان

(۱) شركة مفاوضة وهي أن يشترك متساويان تصرفا ودينا ومالا وربحا وتتضمن الوكالة والكفالة (ملتقى الأبحر: ۱/۵۴۷، شاملة)

(۲) وأما شركة العنان فتنعقد على الوكالة دون الكفالة، ويصح التفاضل في المال، ويصح أن يتساويا في المال ويتفاضلا في الربح، ويجوز أن يعقدها كل واحد منهما ببعض ماله دون بعض. (قدری علی هامش اللباب: ۲/۱۲۵)

(۳) (منها) أهلية الوكالة؛ لأن الوكالة لازمة في الكل وهي أن يصير كل واحد (بدائع: ۶/۶۲، شاملہ) (لا تصح شركة في احتطاب واحتشاش واصطياد واستقاء وسائر مباحات) كاجتناء ثمار من جبال وطلب معدن من كنز وطبخ آجر من طين مباح۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار: ۴/۳۲۵، شاملة) (ومنها): أن يكون الربح جزءا شائعا في الجملة، لا معينا... (ومنها): أن يكون رأس مال الشركة عينا حاضرا لا دينا، ولا مالا غائبا، فإن كان لا تجوز عنانا (بدائع: ۶/۶۰ شاملة) مع التفاصل فى المال دون الربح وعكسه [درمختار] وإن شرط الربح للعامل أكثر من رأس ماله جاز (شامي: ۶/۴۸۱، زكريا)

(۴) انظر تخريجه تحت ضابطة: ۵۲۲۔

حوالجات شجرہ (۵): مزارعت کا بیان

(۱) (منها): أن تكون الأرض والبذر والبقر والآلة من جانب، والعمل من جانب وهذا جائز... (ومنها): أن تكون الأرض من جانب، والباقي كله من جانب، وهذا أيضا جائز... (ومنها): أن تكون الأرض والبذر من جانب والبقر والآلة والعمل من جانب فهذا أيضا جائز (بدائع الصنائع: ۶/۱۷۹، شاملہ)

(۲) (ومنها): أن تكون الأرض والبقر من جانب، والبذر والعمل من

جانب وهذا لا يجوز في ظاهر الرواية، وروي عن أبي يوسف أنه يجوز... (ومنها): أن يكون البذر والبقر من جانب، والأرض والعمل من جانب، وهذا لا يجوز أيضا؛ لأن صاحب البذر يصير مستأجرا للأرض والعامل جميعا ببعض الخارج، والجمع بينهما يمنع صحة المزارعة.(ومنها) : أن يكون البذر من جانب، والباقي كله من جانب، وهذا لا يجوز أيضا؛ لما قلنا وروي عن أبي يوسف في هذين الفصلين أيضا أنه يجوز۔ (الحوالة السابقة)

(۳) (ومنها) : أن يشترط في عقد المزارعة أن يكون بعض البذر من قبل أحدهما، والبعض من قبل الآخر، وهذا لا يجوز؛ لأن كل واحد منهما يصير مستأجرا صاحبه في قدر بذره، فيجتمع استئجار الأرض والعمل من جانب واحد وإنه مفسد. (بدائع:۶/۱۸۰،شاملہ)

حوالجات شجرہ (۲): اقسام یمین باعتبار زمان

(۱) واليمين اللغو: أن يحلف على أمر ماض) مثل أن يحلف على شيء أنه فعله أو لم يفعله (وهو يظن أنه كما قال، و) كان (الأمر بخلافه) وقد يقع على الحال مثل أن يحلف أنه زيد وإنما هو عمرو...(فهذه) اليمين (نرجو أن لا يؤاخذ الله بها صاحبها) (اللباب في شرح الكتاب:۳/۳،شاملة)

(۲) (و) ثالثها (منعقدة وهي حلفه على فعل أو ترك في المستقبل وحكمها وجوب الكفارة إن حنث) لقوله تعالى (مجمع الانہر:۱/۵۳۹،شاملہ)

(۳) (غموس) هو فعول بمعنى فاعل وهو الحلف على إثبات شيء أو نفيه في الماضي أو الحال يتعمد الكذب...(وحكمها) أي اليمين الغموس (الإثم ولا كفارة فيها) أي في اليمين (مجمع الانہر:۱/۵۳۹) وفي الشامية: قوله فالفارق إلخ) أقول: هناك فارق آخر، وهو أن الغموس تكون في الأزمنة الثلاثة على ما سيأتي واللغو لا تكون في الاستقبال ح۔ (شامی:۳/۷۰۶،شاملہ) وفي

الدر: (و) ثالثها (منعقدة وهي حلفه على) مستقبل (آت) يمكنه فنحو: والله لأموت ولاتطلع الشمس من الغموس (الدرالمختار: ۳/۷۰۸شامله)

حوالجات شجره (۷):

اقسام یمین باعتبار اطلاق وتقیید

(۱-۲-۳-۴) مستفاد من هذه العبارات: فالحلف لا يخلو إما أن يكون مطلقا عن الوقت وإما أن يكون موقتا بوقت وكل ذلك لا يخلو إما أن يكون في الإثبات أو في النفي فإن كان مطلقا في الإثبات بأن قال والله لآكلن هذا الرغيف ... فما دام الحالف والمحلوف عليه قائمين لا يحنث لأن الحنث في اليمين المطلقة يتعلق بفوات البر في جميع البر فما داما قائمين لا يقع اليأس عن تحقيق البر فلا يحنث فإذا هلك أحدهما يحنث لوقوع العجز عن تحقيقه غير أنه إذا هلك المحلوف عليه يحنث وقت هلاكه وإذا هلك الحالف يحنث في آخر جزء من أجزاء حياته لأن الحنث في الحالين بفوات البر. ووقت فوات البر في هلاك المحلوف عليه وقت هلاكه، وفي هلاك الحالف آخر جزء من أجزاء حياته وإن كان في النفي بأن قال والله لا آكل هذا الرغيف أو لا أشرب الماء الذي في هذا الكوز فلم يأكل ولم يشرب الماء حتى هلك أحدهما فقد بر في يمينه لوجود شرط البر وهو عدم الأكل والشرب، وإن كان موقتا بوقت فالوقت نوعان موقت نصا وموقت دلالة أما الموقت نصا فإن كان في الإثبات بأن قال والله لآكلن هذا الرغيف اليوم ...ونحو ذلك فما دام الحالف والمحلوف عليه قائمين والوقت قائما لا يحنث لأن البر في الوقت مرجو فتبقى اليمين وإن كان الحالف والمحلوف عليه قائمين ومضى الوقت يحنث في قولهم جميعا لأن اليمين كانت مؤقتة بوقت فإذا لم يفعل المحلوف عليه حتى مضى الوقت وقع اليأس عن فعله في الوقت ففات البر عن الوقت

فيحنث. وإن هلك الحالف في الوقت والمحلوف عليه قائم فمضى الوقت لا يحنث بالإجماع لأن الحنث في اليمين المؤقتة بوقت يقع في آخر أجزاء الوقت وهو ميت في ذلك الوقت والميت لا يوصف بالحنث وإن هلك المحلوف عليه والحالف قائم والوقت باق فيبطل اليمين في قول أبي حنيفة ومحمد وزفر وعند أبي يوسف لا تبطل ...وإن كان في النفي فمضى الوقت والحالف والمحلوف عليه قائمان فقد بر في يمينه لوجود شرط البر وكذلك إن هلك الحالف والمحلوف عليه في الوقت لما قلنا وإن فعل المحلوف عليه في الوقت حنث لوجود شرط الحنث وهو الفعل في الوقت والله - عز وجل - أعلم. (وأما) المؤقت دلالة فهو المسمى يمين الفور...وهو أن يكون اليمين مطلقا عن الوقت نصا، ودلالة الحال تدل على تقييد الشرط بالفور بأن خرج جوابا لكلام أو بناء على أمر نحو أن يقول لآخر: تعال تغد معي، فقال: والله لا أتغدى فلم يتغد معه ثم رجع إلى منزله فتغدى لا يحنث استحسانا۔ (بدائع الصنائع: ۳/ ۱۲) وأما يمين الفور ... نحو أن تتهيأ المرأة للخروج فقال: إن خرجت فأنت طالق فقعدت ساعة ثم خرجت لا تطلق الخ. (الجوهرة النيرة: ۲/ ۱۹۱، شاملہ)

قال المؤلف عفى الله عنه: قد تم المجلد الثالث بحمد الله تعالیٰ وتوفيقه ويتلوه إن شاء الله تعالیٰ المجلد الرابع۔

وصلى الله تعالیٰ على خير خلقه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وبارك وسلم تسليماً كثيراً۔

یہ کتاب!

یہ کتاب طلبہ کے لئے تو مفید ہے ہی، اساتذہ کے لئے بھی مفید ہے، اگر اساتذہ اس کا مطالعہ کریں تو ان کی فقہ کی تعلیم میں چار چاند لگ جائیں گے اور ان کے لئے بکھری ہوئی جزئیات کو ایک لڑی میں پرو کر پیش کرنا آسان ہو جائے گا۔

(محدث کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری)

مؤلف کی یہ کاوش 'تالیف برائے تالیف' نہیں ہے، بلکہ ثاقعی اس سے ایک ایسے گوشہ کی تکمیل ہوتی ہے جس پر کام کی ضرورت تھی..... مؤلف عزیز نے صرف نقل ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ استنباط سے بھی کام لیا ہے..... غالباً اردو زبان میں اس طرح کی یہ پہلی کوشش ہے، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ کے اساتذہ وطلبہ کے لئے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہے.... اگر اساتذہ اس کتاب کو اپنے سامنے رکھیں گے تو انشاء اللہ نفع محسوس کریں گے۔

(فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی)

امید ہے کہ یہ کتاب ''تعریفات جرجانی'' سے بھی برصغیر کے علماء اور طلبہ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ (حضرت مفتی شبیر احمد صاحب شاہی مراد آباد)

اس کتاب کے مطالعہ سے بالخصوص فقہ و فتاویٰ میں مشغول طلبہ و اساتذہ کو بھر پور رہنمائی ملے گی، فقہی کتابوں کا سمجھنا آسان ہوگا اور علم میں بصیرت اور جلاء پیدا ہوگی۔

(حضرت مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری)

MAKTABA HIJAZ

Urdu Bazar, Jama Masjid, Deoband-247554
Distt. Saharanpur (U.P.) India
Mobile : 09358914948 , 09997866990